3459

شیرازہ

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

3459

ماہنامہ

شیرازہ

سرینگر، کشمیر

جلد: ۴۶ شمارہ: ۲

نگراں:

ظفر اقبال منہاس

مُدیر:

محمد اشرف ٹاک

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ناشر : سیکریٹری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

کمپوزنگ: بشارت احمد بابا

مطبع: جے، کے، آفسیٹ پرنٹرس۔ نئی دہلی

تصاویر: غلام محی الدّین

شیرازہ میں جو مضامین شائع ہوتے ہیں اُن میں ظاہر کی گئی آراء سے اکیڈیمی یا ادارے کا کُلّاً یا جُزواً اتفاق ضروری نہیں۔

سَرورق عمل: بشیر احمد

☆.....خط و کتابت کا پتہ:

محمّد اَشرف ٹاک

ایڈیٹر "شیرازہ" اردو

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

سرینگر / جموں

فہرست

☆ حرفِ آغاز — محمد اشرف ٹاک — ۴

☆ خواجہ عبدالصمد ککرو مقبل — خاندان، شخصیت اور سماجی خدمات — اعجاز احمد ککرو — ۵

☆ اقبال اور خواجہ عبدالصمد ککرو — کلیم اختر — ۱۸

☆ کشمیری لوک اَدب اور لوک گیت — غلام نبی ناظر — ۳۱

☆ شاعرِ تاجدار، بہادر شاہ ظفر — پروفیسر شہاب عنایت ملک — ۳۹

منظومات — میری ماں! میری محسن — ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام — ترجمہ: تنہا نظامی — ۵۱

☆ تنکے کی تقدیر، ایک شہر، اک فسانہ — ۵۳

☆ کاغذی دامن، حکمِ موت — زاہد مختار — ۵۴

☆ تاریخی مغل روڈ۔ ایک جائزہ — کے۔ ڈی۔ مینی — ۵۵

☆ لحاف کا شاخسانہ — ڈاکٹر دل افروز گنجو — ۶۰

غزلیں — عرش صہبائی ۷۱ عاصم امروہوی ۷۲ رفیق راز ۷۳

☆ بلراج بخشی ۷۴ پرویز مانوس ۷۵ رئیس الدین رئیس ۷۸

افسانے — یاترا سے لوٹی پوتر لڑکی — کشمیری لال ذاکر — ۸۰

☆ شکر بابا — مشتاق مہدی — ۸۸

☆ پری تم کہاں ہو — احمد کلیم فیض پوری — ۹۳

تبصرۂ کتب — بند کمرے کی کھڑکی — مصنف نور شاہ / تبصرہ عمر مجید — ۱۰۳

☆ نور شاہ کا افسانوی مجموعہ بے ثمر سچ — زاہد مختار — ۱۰۹

—☆—

حرفِ آغاز

ریاست کی علمی ادبی اور ثقافتی روایات کو جن شخصیات نے وقتاً فوقتاً پروان چڑھایا اُن میں خواجہ عبدالصمد مقبلؔ کاشمیری کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔ آپ اُس خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس کے اسلاف نے کشمیر کی تواریخ پر اَنمٹ نقوش رقم کئے۔ اُن کے اجداد نے شاہی خان کی اُس وقت مدد کی جب وہ اپنے بھائی کے ساتھ تخت نشینی کی جنگ میں اُلجھا ہوا تھا اور اُن کی مدد سے وہ کشمیر کے تخت پر سلطان زین العابدین بڈشاہ کے لقب سے جلوہ افروز ہو گیا۔ بعد میں بھی یہ خاندان کسی نہ کسی صورت میں تاریخ کشمیر کے اہم واقعات سے جُڑا رہا۔ اِسی خاندان کے چشم و چراغ خواجہ عبدالصمد ککرو نے کشمیر کی سیاسی، سماجی، علمی اور اَدبی حلقوں میں نمایاں نام پیدا کیا ہے۔ آپ کے اپنے وقت کے سرکردہ عالموں بعد فاضلوں کے ساتھ روابط تھے جن میں منشی محمد الدّین فوق اور علامہ اقبال سرفہرست ہیں۔ خواجہ عبدالصمد ککرو نے بیسوی صدی کی ابتدا میں اپنے ہموطنوں کو پسماندگی، غریبی اور جہالت سے نجات دِلوانے کے لئے کشمیر سے باہر کئی اصلاحی تحریکوں کی داغ بیل ڈالی اور ان کی فلاح و بہبود کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ آپ فارسی، اردو اور انگریزی ادبیات پر گہری نظر رکھتے تھے اور اُن کا اچھا خاصا ذخیرۂ کلام اُن کی اُستادانہ صلاحیتوں کا غماز ہے۔

زیرِ نظر شمارے میں خواجہ عبدالصمد ککرو مقبلؔ کاشمیری کی حیات اور خدمات کا احاطہ کرنے والے دو مضامین شامل ہیں جن میں سے ایک جناب کلیم اختر خاص طور سے پاکستان سے مرحمت فرمایا ہے۔

اُمید ہے کہ شمارے میں شامل دیگر مشمولات بھی آپ کی پسندیدگی کا درجہ حاصل کر لیں گی۔

محمد اشرف ٹاک

اعجاز احمد ککرو

خواجہ عبدالصمد ککرو مقبلؔ

خاندان، شخصیت اور سماجی خدمات

ککرو خاندان کا تعلق گکھڑ قبیلہ سے ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں TheValley of Kashmir کے مصنف سر والٹر لارنس صفحہ ۳۰۸ پر رقمطراز ہیں:

"The Kakru families, who are settled in Baramullah, are said to be descendents of Ghakhar tribe, and like the Tsak have no connection with the original Hindus of Kashmir"

اِس سلسلے میں تاریخ حسن کے مصنف خواجہ حسن کھویہامی قصبہ بارہمولہ کے ذکر میں فرماتے ہیں:

"مردم آن جاں اکثر بقال وبعضے بافندہ وچھینٹ ساز
زمیندار عموماً صاحب مروت و خوش نہاد
رؤسائی آن جانیک محضر از قوم گکھڑ کہ فے الحال
باسم ککرو ملقب گشتہ اند تجارت کا مراج وکروہن
وغیرہ اطراف دچھنہ وکھاورہ دراں جامی گذرد"

(تاریخ حسن، جلد اول ص ۳۵۸)

گکھڑ یا گکھڑ اصل میں فارس سے تعلق رکھتے ہیں اور اس قبیلے کے جد اعلیٰ سلطان کیدراج نے سکندر اعظم کے حملے سے پہلے پنجاب پر تقریباً ۴۳ سال تک حکومت کی۔ چنانچہ دہلی کے بانی راجہ ڈلہو Dilhu کا بھائی جے چند کیدراج کا سپہ سالار تھا اور اس نے ساٹھ سال تک ہندوستان پر حکومت کی۔ راجہ پورس سے پہلے ۳۹۰ قبل مسیح میں کیدراج پنجاب پر حکومت کیا کرتا تھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سکھدیو سنگھ چرک اپنی تصنیف A Short Story of Jammu Raj, Editon 1985 کے صفحات ۴۲ اور ۴۳ پر رقمطراز ہے:

"Kaid Raj ruled Punjab some decades before Paurava, Paurava came to power in 340 B.C Kaid Raj must have remained ruler of Punjab from about 390 BC as he is stated to have ruled Punjab for 43 years."

اسکے بعد ڈاکٹر سکھدیو سنگھ تاریخ فرشتہ سے استفادہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"Ferishta states that Kaid Raj dwelt for some time in one of the cities of Behra, and then built the fort of Jammu. In it he placed one of the adherents a man of the Ghakhar Tribe, namely Durg and made him Governor of it. "From that day" asserts Ferishta, "that fortress has remained in the possession of that tribe till now (i,e; upto about 1610 AD)

اس کے معاً ڈاکٹر چرک گکھڑ یا گکرو خاندان کے Origin کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"These Ghakhars are, in fact, Khokhars, who claim a Persian descent, from Sultan Kaid, son of Kaigohar (The Punjab Gazetteer Rawalpindi Distt. P.31). This kaid was probably the Kaid Raj

who held sway over Gandhar and the Punjab as a Persian Satrap of the Chaemerians, with Jaichand as his Governor of his provicne of the North West Punjab. Gen. Cunningham identifies these with the subjects of Abhisari, mentioned by Alexander's historians as being king of the hilly country North and North East of Taxila, mentioned as Abhisara in the Mahabharata and the Puranas. The tradition preserved among the Khokhars of Kharain on the Beas , also confirms their origin from Kabul Shah of Kabul, i,e, Gandhara. These Khokhars became very powerful during the 14th and 15th centuries and Timur had to kill their leader Sheikha and capture and carry away his son Jasrath a prisioner in 1399. Timur also mentions of a fort near Jammu which was in possession of a Khokhar chief related to Sheikha Khokhar.

The Khokhar chief thus ruled over the Northern Punjab from Takshila during the Pre-Alexander period and a number of their rulers have been included in the Jamu Vansavali.

(Cunningham, Sir A Ane Geog of India p.208)

شیخا گکھڑ کے بارے میں اپنی تحقیقات کے نتائج بیان کرتے ہوئے

ڈاکٹر سکھدیو سنگھ لکھتے ہیں:

"One of the eminent chiefs of Khokhars of Jammu region was Sarpal. Sixth from him in descent was Chuchak or Anchu and Malik Shaikha, the contemporary of Raja Mal Dev was the Seventh [51]. Shaikha is said to have founded a fort called Shaikha after him and also a village named

Dhanbhar (probably Tekhar) in the hills of Bhawan, north of Mangla holding the hill country and the tracts of Gujarat[52]. But Sheikh soon became so powerful that he was appointed Governor of Lahore by the Sultan of Delhi and his brother Nusrat opposed Timur's army on behalf of the Tughlaks, with only 2000 men on the Beas." (P.66)

51: A Glossary of the tribes of Punjab etc. p 500)

52: Ibid.see also Raj Darshani SPM folio 142 b

شیخا گکھڑ کو آخر تیمور نے گرفتار کر کے مروا ڈالا اور اس کے بیٹے جسرت کو سمرقند میں قیدی بنایا گیا۔ چنانچہ ملفوظاتِ تیموری کے صفحہ نمبرات ۵۶۔۴۵۵ کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر سنگھ لکھتے ہیں:

"After his arrest by Timur, Shaikha disappears from History . Some authorities say that Shaikha died a natural death while others allege that he was put to death.[58]. Jasrath his son, being imprisoned in Samarqand, purchased his release after Timur's death in 1405 AD and came to the Punjab, gathered a strength and reappeared on the scene in 1420 AD.

58: (Ibid p :67 The Malfuzat-i- Timuri, HAED III 455-56

رئیس گکھڑاں نے ۶۰۲ھ میں شہاب الدین غوری کے عہد میں اپنے ہزاروں افرادِ قبیلہ کے ساتھ اسلام قبول کیا۔ امیر تیمور، جنہیں عام طور سے تیمور لنگ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، کے دربار میں شاہی خان (جو بعد میں بڈ شاہ کے لقب سے کشمیر کے تخت پر رونق افروز ہوا) اور راجہ جسرت گکھڑ کے مابین دوستی کا رشتہ استوار ہوا اور جب سلطان علی شاہ (۲۰۔۱۴۱۳) اور سلطان زین العابدین (۷۰۔۱۴۲۰) کے درمیان تخت نشینی کیلئے جنگ ہوئی تو راجہ جسرت گکھڑ نے زین العابدین شاہی خان کی مدد کر کے اُسے کشمیر کے تخت پر جلوہ افروز

کیا۔ چنانچہ Kashir کے مصنف جی ایم ڈی صوفی صفحہ ۴۰۶ پر رقمطراز ہیں:

"Then Shahi Khan and Hasrat Khan Ghakhar succeeded in defeating and taking Ali Shah prisoner. Ali Shah subsequently died at Chadura.[2]

(2: Tarikh Kashmir Malik Haider Chadura p.142)

بڈ شاہ اپنے محسن راجہ جسرت گکھڑ کو نہ بھول سکا۔ اس نے اپنے ایک بیٹے کا نام جسرت رکھا اور سلطنت دہلی کے ساتھ لڑائیوں میں ہمیشہ جسرت گکھڑ کی مدد کرتا رہا۔ اس سلسلے میں P.N. Koul Bamzai اپنی کتاب A History of Kashmir کے صفحہ ۲۹۸ پر لکھتے ہیں:

"Shahi Khan retur--ned victorious to the valley and ascended the throne in June 1420 AD under the title of Zain-ul-Abidin. He was not unmindful of his benefactor, Jasrath , whose later successes in the Punjab were due, in part, to the support received from Kashmir."

اس سلسلے میں Delhi Sultanate کے صفحہ ۳۸۱ کا حوالہ دیتے ہوئے پی این کول بامزئی لکھتے ہیں:

" Jonaraja also tells us that Zain-ul-Abidin gave shelter to Jasrath when he was hard pressed by the Lord of Delhi."

اسی زمانہ میں بقولِ مصنف ''تاریخ اقوام کشمیر'' جناب محمد دین فوق گکھڑ پہلی مرتبہ کشمیر میں داخل ہوئے اور اس خاندان کے کمال خان گکھڑ اور ابراہیم خان گکھڑ نے سلطانِ کشمیر کی نمک حلالی میں نام پیدا کیا۔

گکھڑ خاندان کے ایک نامی شخص خواجہ احمد گکھڑ سید روشن شاہ پکھلی وال کے سلسلۂ ارادت سے منسلک ہوئے اور ان ہی کے ارشاد کے مطابق کشمیر واپس

آ کر بار ہمولہ میں اقامت گزیں ہوئے۔ بقول محمد دین فوق' خواجہ احمد گکھڑ راجہ جسرت خان کی اولاد سے تھا۔

خواجہ احمد گکھڑ کے سلسلۂ نسب میں تیرہویں صدی ہجری میں خواجہ عزیز جُو ککرو اور خواجہ علی جُو ککرو گزرے ہیں۔ خواجہ علی جُو ککرو کے گھر میں تیرہویں صدی کی چھٹی دہائی میں خواجہ عبدالصمد ککرو پیدا ہوئے۔ خواجہ صاحب ابتداء سے ہی ایک دردمند دل رکھتے تھے۔ بقولِ کلیم اختر "خواجہ عبدالصمد ککرو..... اپنی اسلام دوستی، عشقِ رسولؐ اور علم پروری کی وجہ سے مشہور تھے۔ آپ خود عالمِ دین تھے اور عالموں کے قدرداں بھی۔ فارسی زبان اور اردو علوم وادبیات میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔

کلیم اختر کی تحقیق کے مطابق "خواجہ عبدالصمد ککرو مرحوم نے ریاست میں سب سے پہلے اصلاحی تحریک کا آغاز کیا اور اپنی تحریک کا نصب العین اشاعتِ دینِ اسلام ٹھہرایا۔ جامع مسجد بار ہمولہ کی تعمیر اپنی گرہ سے کی۔" چنانچہ جامع بار ہمولہ کے زیرِ عنوان خواجہ حسن کھویہامی تاریخِ حسن جلدِ اوّل صفحہ ۳۵۰ پر رقمطراز ہیں:

"بنامی اولش از بڈھ شاہ بود و در عہد چغت مرمت یافت و شیخ محی الدین[۱۱۱]
بام آن درست نمود و در ۱۳۰۲ھ[۱۱۲] بہ حادثۂ زلزلہ با خاک آمیخت و در ۱۳۱۳ھ[۱۱۳]
خواجہ عبدالصمد ککرو تجدید آن فرمود۔

یہ عجیب حُسنِ اتفاق ہے کہ خواجہ عبدالصمد کے جدِ اعلیٰ راجہ جسرت گکھڑ نے بڈ شاہ کو تخت نشین ہونے میں مدد دی تھی اور انہوں نے پونے پانچ سو سال بعد بڈ شاہ کی بنا کردہ جامع مسجد بار ہمولہ کی تجدیدِ نو کردی۔ تاریخ کے طالب علم کیلئے یہ بات قابلِ غور ہے کہ ۱۳۰۲ھ کے زلزلے نے تقریباً اکثر خانقاہوں اور مسجدوں کو سربسجود کردیا۔ چنانچہ خواجہ حسن کھویہامی اس سلسلے میں خانقاہِ سوپور کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں:

'سلطان سکندر بہ تجویز میر محمد ہمدانی احداث کردہ بود بعد آن معتقد ایشان مرمت آن می کردند و بہ حادثہ زلزلہ ۱۳۰۲ھ ۱۱۱۴ زیادر افتادہ خواجہ عزیز اللہ ککرو در تجدید بنامی آن بسیار کوشید'.....(صفحہ ۳۵۱)

چنانچہ اس خانقاہِ عالیہ کی تعمیر و تجدید بھی اس خاندان کے ایک نامور بزرگ اور اپنے دَور کے ملک التجار خواجہ عزیز جو ککرو کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

جامع مسجد بارہمولہ کے دروازے پر جو سنگِ مرمر پر کھدا ہوا نقش ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

من بنیٰ مسجدِ اللہِ بنی اللہ لہٗ بیتاً فی الجنۃ (رواہ مسلم)

سجدۂ شکر سرکن ای سامع کاختر انما شدہ لامع
کرداند بنائے مسجد جد خواجہ عبدالصمد زہے ہامع
زد ندا ملہم از سر تعمیر گشتہ معمور مسجد جامع

۱۳۱۳ھ

کلیم اختر اپنے مضمون 'اقبال اور خواجہ عبدالصمد ککرو' میں رقمطراز ہیں:

''خواجہ عبدالصمد ککرو نے.....اپنے عظیم باپ کی روایات کو بھی گلے سے لگائے رکھا۔''

اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ خواجہ عبدالصمد کے والد خواجہ علی جو ککرو نے زیارت جانبازؒ صاحب بارہمولہ تعمیر کردی اور اس کے ملحقہ مسجد کا بنا بھی کردیا۔ خواجہ عبدالصمد ککرو کی کوششوں سے ہی مسجد شریف جامع سرینگر کی تعمیر کیلئے حکومت جموں و کشمیر نے مالیہ کے ساتھ مسجد جامع فنڈ کو لوگوں سے وصول کیا اور تا اختتامِ تعمیر یہ سلسلہ جاری رہا۔ بارہمولہ میں مدرسہ فیض عام کی بنیاد بھی ککرو خاندان نے ہی ڈالی جس میں محدثِ شہیر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے کئی سال درس دیا۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ کے فرزند انظر شاہ مسعودی اپنی کتاب

نقشِ دوام کے صفحہ ۳۵ پر رقمطراز ہیں:

''۸ ربیع الاول ۱۳۱۹ھ تک شاہ صاحب نے امینیہ میں درس دیا اور پھر اپنی والدہ مرحومہ کی وفات پر کشمیر کا سفر فرمایا۔ کشمیر پہنچے تو ابنائے وطن کی جہالت وبدعات ومحدثات کا استیلا، قزاقان دین پیروں کا تسلط، دین سے بیگانگی۔ ان حالات نے مرحوم کو کشمیر ہی میں قیام اور وطن کی خدمت کیلئے خاص نصب العین کے مطابق کام کرنے کیلئے مجبور کیا۔ ابھی یہ خیالات آپ کے قلب ودماغ میں تھے کہ بارہمولہ کے رئیس خاندان خواجہ عبدالصمد ککرو کے اصرار پر مدرسہ فیضِ عام کی بنیاد ڈالی۔'' ویسے حقیقت یہ ہے کہ مدرسہ فیض عام کی بنیاد خواجہ امیر الدین ککرو کے اصرار پر ڈالی گئی تھی۔

خواجہ عبدالصمد ککرو مرحوم کو آیت من آیات اللہ' علامہ انور شاہؒ سے زبردست عقیدت تھی۔ چنانچہ مولانا اور دیگر نو اَفراد کو ساتھ لے کر ۱۳۲۳ھ میں سفرِ حج کیلئے روانہ ہوئے۔ اس سلسلے میں 'نقشِ دَوام' کے مصنّف انظر شاہ مسعودی 'سفرِ حرمین' کے زیرِ عنوان رقمطراز ہیں:

''بارہمولہ کے قیام کے دوران حرمین کی زیارت کی آرزو ہوئی۔ ککرو خاندان کے بعض افراد کا تعاون اس آرزو کی تکمیل کا ذریعہ بن گیا۔ فیضِ عام کا انتظام بعض مخلص لوگوں کی طرف منتقل کر کے ۱۳۲۳ھ میں سفرِ حج کیلئے روانہ ہو گئے۔ حرمین شریفین سے واپس پر ۱۳۲۴ھ تک مسلسل فیضِ عام ہی کی خدمت میں وقت گذارا۔''

خواجہ صاحب حضرت علامہ کی سفرِ حج کے دوران تقویٰ، انابت الی اللہ، علم وفضل اور مرتبہ ومقام سے اتنے متاثر تھے کہ میں نے اپنے والد خواجہ غلام حسن ککرو مرحوم سے سنا ہے کہ جب حضرت علامہ، خواجہ امیر الدین ککرو کے دیوان

خانے پر تشریف فرما ہوتے تھے اور خواجہ صمد اُن سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے کیلئے آتے تھے تو دریافت فرماتے "یہ چھامُلک صاب اُتی" (کیا یہ فرشتہ (علامہ انور شاہ) یہیں ہے۔"

خواجہ عبدالصمد لکھرو مرحوم آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بھی رکن تھے اور ۱۹۰۶ء کے ڈھاکہ کے ابتدائی اجلاس میں شرکت کرنے کی بناء پر آپ کا شمار آل انڈیا مسلم لیگ کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ آپ نے ہر پلیٹ فارم سے حکومت ہند کی توجہ ریاستی مسائل کی طرف مبذول کرائی اور اہلِ خطہ کے نکبت و ادبار سے آشنا کیا۔ آپ کی بے پایاں جرأت کا ایک واقعہ یہاں پر درج کرنا غیر ضروری نہیں ہوگا۔ اس کے راوی میرے والدِ محترم ہیں:

'مہاراجہ پرتاپ سنگھ جن دنوں حکمران تھے، شاہی دربار میں ان کے اور ان کے بھائی راجہ امر سنگھ کے درمیان چشمک اور رقابت چل رہی تھی۔ خواجہ صمد' پرتاپ سنگھ کے حامی تھے جبکہ خواجہ امیر جو لکھرو راجہ امر سنگھ کے ساتھی تھے۔ بارہمولہ کے ایک جلسہ میں جو غالباً ستمبر ۱۹۰۷ء میں ہوا اور جس میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے ساتھ تمام وزراء، امراء اور اعلیٰ عہدیدار موجود تھے۔ راجہ امر سنگھ بھی ڈائس پر تشریف فرما تھے۔ خواجہ صمد نے اپنی تقریر میں یہ شعر پڑھ کر سامعین کو ششدر کر دیا۔

گلِ اقبال تو دائم شگفتہ
بچشم دشمنانت خار بادا

خواجہ صاحب نے پہلا مصرعہ پڑھتے ہوئے اشارہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی طرف اور دوسرا مصرعہ پڑھتے ہوئے راجہ امر سنگھ کی طرف کر دیا۔"

خواجہ صاحب مرحوم کے تعلقات بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور ادبی افق پر چھائے ہوئے تمام عبقری شخصیات سے تھے۔ ان

میں سر سید احمد خان، شبلی نعمانی، ڈاکٹر انصاری، مولانا حالی، حکیم اجمل خان، نواب سلیم اللہ آف ڈھاکہ، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولانا حسرت موہانی، سید میر حسن شاہ سیالکوٹی اور شاعرِ مشرق علامہ اقبال شامل ہیں۔

علامہ اقبالؒ کے ساتھ ان کی گہری دوستی تھی۔ چنانچہ خواجہ صمد کے فرزند غلام حسن کے مرگِ ناگہاں پر علامہ اقبالؒ نے مرحوم کا نوحہ لکھا جو مخزن، جولائی ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

اندھیرا صمد کا مکان ہوگیا — وہ خورشید روشن نہاں ہوگیا
غضب ہے غلام حسن کا فراق — کہ جینا بھی مجھ کو گراں ہوگیا
دیا چن کے وہ غم فلک نے اسے — کہ مقبل سراپا فغان ہوگیا

خواجہ عبدالصمد انجمنِ حمایت اسلام لاہور کے بانی رکن تھے۔ انجمن کے سالانہ جلسوں میں وہ پابندی سے شرکت کرتے تھے اور انجمن کے سالانہ اجلاس ۲۷ تا ۲۸ فروری ۱۹۰۳ء یکم مارچ ۱۹۰۳ء کی روداد میں درج ہے کہ جب اس اجلاس میں علامہ اقبالؒ نے اپنی نظم 'فریادِ اُمت' پڑھی تو:

''خواجہ عبدالصمد ککرو نے شیخ محمد اقبال صاحب کو اس نظم کے صلے میں ایک نقرئی تمغہ پہنایا جو خواجہ صاحب کشمیر سے بنوا کر لائے تھے۔''

(محمد حنیف شاہد، اقبال اور انجمن حمایت اسلام ص ۷۸)

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ۱۹۱۱ء کا ہے جس کا ذکر 'روزگارِ فقیر' کے مصنف فقیر سید وحید الدین کرتے ہیں:

''۱۹۱۱ء کا واقعہ ہے جب انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی مشہور نظم 'شکوہ' خاص انداز میں پڑھی۔ ڈاکٹر صاحب کی عمر

اس وقت ۳۵ سال کی تھی۔ رواز ہوسٹل کے اس تاریخی اجتماع اور روح پرور اجلاس میں ڈاکٹر صاحب کے والد شیخ نور محمد بھی موجود تھے اور نامور فرزند کے شاعرانہ کمال اور ہر دلعزیزی کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

ڈاکٹر صاحب جب نظم پڑھ چکے تو ان کے ایک بڑے مداح اور قدر شناس خواجہ صمد آگے بڑھے اور جوشِ مسرّت میں اپنا قیمتی دوشالہ ڈاکٹر صاحب کے شانوں پر ڈال دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ دوشالہ اسی وقت انجمن کے منتظمین کو دے دیا۔ اس کے بعد یہ یادگار اور متبرک دوشالہ اس مجمع عام میں نیلام کیا گیا۔ اور سب سے بڑی بولی ختم ہونے پر جو رقم موصول ہوئی وہ انجمن حمایت اسلام کی تحویل میں دے دی گئی۔

خواجہ صمد ایک خوشحال تاجر اور صاحبِ دل انسان تھے۔ ڈاکٹر صاحب ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ (روزگارِ فقیر جلد اوّل۔ صفحہ نمبر ۱۲۳)

خواجہ صمد کا مرتبہ شاعرِ مشرق کے نزدیک کیا تھا، اس کا اظہار انہوں نے اپنے ایک شعر میں کیا ہے۔

خواجۂ خواجگاں صمد ککرو　　آنکہ دارد قیام در کشمیر

خواجہ صاحب ایک آتش بیان مقرر تھے۔ اس سلسلے میں "برگِ سبز" کے زیرِ عنوان شائع شدہ کتابچہ آپ کی قوتِ تقریر اور شدّتِ تاثیر کی ایک جھلک پیش کرتا ہے۔

خواجہ عبدالصمد ککرو ایک اعلیٰ پایہ کے شاعر اور سخنور بھی تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں مقبلؔ اور اردو میں صمدؔ تخلص کرتے تھے۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ کی نظم 'ماتمِ پسر' پر سر عبدالقادر مرحوم، مدیر 'مخزن' نے شذرہ میں لکھا تھا 'ہمارے ایک عنایت فرما رئیسِ بارہمولہ علاقہ کشمیر خواجہ عبدالصمد ککرو ہیں..... خواجہ صاحب ذی علم اور علم دوست رئیس ہیں اور خود فارسی زبان میں

طباع شاعر ہیں اور مقبل تخلص کرتے ہیں۔ (مخزن جولائی ۱۹۰۲ء)

افسوس، اخلاف کی سخن ناشناسی کی وجہ سے ان کے کلام کا اکثر حصہ زمانے کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکا باوجود اسکے وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ اپنی زندگی میں ہی انہوں نے اپنے لوحِ مزار کیلئے درجِ ذیل مناجات کندہ کرائے تھے۔

ابیات مناجات از تصنیف حاجی عبدالصمد ککرو:

الٰہی مناہی بسے ساختم — بسوئے اوامر نپرداختم
ہمہ عمر من تا بشیب و شباب — شد از فرطِ عصیاں ونسیان
بسے روسیا ہم بمردم خجل — زکردار خود بس بدم منفعل
بترسم برپاداش افعال زشت — کن از فضل دارالامانم بہشت
دریں دارِ دنیاز من کارِ دین — بغفلت نیادر بمردم حزین
زفرطِ گناہم شدہ روسیاہ — بدرگاہ تو میشوم عذر خواہ
بتو ہست موجود ہر نیک و بد — کلامت صحیح است ونامت صمد
بدامان عفوت زدم دست دل — نوازی نسازی خراب وخجل
محاسب تو شو بر گنایان من — زعفوت زیادست عصیان من
کریما کرم کن بحال غریب — رحیما زرحمت مراں بے نصیب
اگر مد برم کن تو مقبل مرا — بپاس محمدؐ شفیع الورائے

اسی طرح ان کی قبر کے دو اطراف مندرجہ ذیل اشعار کندہ ہیں:

خدایا برین تربت خاکسار — بفضلت کباران رحمت بیار
نکوکن چوکردار خود کار من — مکن کار برمن چوکردار من

یہ خواجہ عبدالصمد ککرو مقبل کی حیات اور خدمات کا ایک اجمالی خاکہ ہے اور دل سے بے ساختہ دعا نکلتی ہے۔

خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

پچاسی سال کی عمر میں آج سے تقریباً نوے سال قبل فوت ہونے والے

بار ہمولہ کے اس عظیم فرزند کی زندگی ہماری بے عملی، کم علمی، تنگ نظری سے بھرپور زندگی کیلئے ایک مشعلِ راہ ہے۔

☆☆☆

حواشیات

۱۱۱: شیخ غلام محی الدین ناظمِ کشمیر

۱۱۱۲: ۱۸۸۴ء

۱۱۱۳: ۱۸۹۵ء

۱۱۱۴: ۱۸۸۴ء

☆☆☆

☆ اپنی نِگارشات صاف صاف' اور کاغذ کے ایک ہی طرف لکھیں۔ تبدیلی پتہ / یا فون نمبر بدلنے کی صورت میں ہمیں مطلع کرنا نہ بھولیں۔ (ادارہ)

کلیم اختر

اقبالؒ اور خواجہ عبدالصمد ککروؒ

راولپنڈی راستے کشمیر جاتے ہوئے بارہ مُولا کا مشہور قصبہ آتا ہے جو سطح سمندر سے ۵۲۰۰ فٹ کی بُلندی پر واقع ہے۔ دیو قامت چٹانیں اور اُونچے اُونچے پہاڑ سڑک کے دونوں جانب ایستادہ ہیں اور دریائے جہلم ایک دہنِ کوہ سے نکل کر سڑک کے ساتھ ساتھ بہتا چلا جاتا ہے جو اِس علاقے کی سرسبزی اور خوب صورتی میں بے حد اضافہ کرتا ہے۔ حقیقت میں یہیں سے حسین و جمیل وادیٔ کشمیر شروع ہوتی ہے۔ یہ قصبہ وادی اور پنجاب و سرحد کے درمیان تجارت کے اعتبار سے ہمیشہ مشہور رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیرونِ کشمیر کی ہر مذہبی، سیاسی اور اصلاحی تحریک کا اثر سب سے پہلے اِسی علاقے میں پہنچتا ہے اور پھر وادی میں بسنے والے بیرونی دنیا کے حالات و کوائف سے آگاہ ہوتے ہیں۔ ظہورِ اسلام سے قبل یہ علاقہ ہندوؤں اور بدھ مت کے پیروکاروں کی آماج گاہ تھا اور انہی عبادت گاہوں کی وجہ سے یہ خاص و عام کی توجہ کا مرکز بھی تھا۔ مگر کشمیر میں مسلمانوں کی آمد اور تبلیغ و اشاعت سے اِس بستی کے مکین حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے اور ساری بستی توحید اور عشقِ رسولؐ سے روشن و مزّین ہوگئی۔ چنانچہ جن بزرگوں اور علمائے کرام کی مساعیٔ جمیلہ سے یہاں اسلام پھیلا اُن میں خواجہ عبدالصمد ککرو مرحوم کے آباواجداد بھی شامل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ریاست

میں ککرو خاندان کو نہایت عزت واحترام سے دیکھا جاتا ہے۔

ممتاز کشمیری مورّخ منشی محمد الدّین فوق "تاریخِ اقوامِ کشمیر" میں لکھتے ہیں:

"بارہ مولا کا ککرو خاندان کسی زمانہ میں بڑے عروج پر رہا ہے۔ اِس عروج کی آخری جھلک راقم مؤلف نے بھی بارہ مولا میں دیکھی ہے۔ حاجی خواجہ عبدالصمد ککرو کا دیوان خانہ، ان کا باغ، مہمان خانہ، سری نگر میں ان کے بنگلے، خواجہ غفار جُو ککرو اور ان کے برادران خواجہ امیر الدّین ککرو اور قادر جُو ککرو کی مہمان نوازیاں، ان کے عالی شان مکانات اور ان کی بزم آرائیاں اُب تک آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہیں۔ خواجہ امیر الدّین مرحوم نے لنگیٹ میں بڑے جاہ وجلال کے ساتھ عرصۂ دراز تک تحصیل داری کی ہے۔ حاجی عبدالصمد ککرو کے حلقۂ احباب کی وسعت کشمیر کے علاوہ پنجاب، ہندوستان اور برما تک پھیلی ہوئی تھی۔ لاہور اور علی گڑھ کے اسلامی جلسوں میں وہ قریباً ہر سال شامل ہوتے تھے۔ جامع مسجد بارہ مُولا، جو بہت قدیم اور خستہ حال تھی، اِنہی کی سعیٔ جمیلہ سے ۱۳۶۳ ہجری میں اَز سرِ نو تعمیر ہوئی۔ ان کا فرزندِ کلاں خواجہ غلام نبی دو سال سے آنکھوں سے معذور ہو چکا ہے۔ ان کے دو اور صاحبزادے ہیں..... خواجہ عنایت اللہ ککرو[1] اور خواجہ حبیب اللہ ککرو۔[2] دونوں

---

[1]: خواجہ عنایت اللہ ککرو وریاست جموں وکشمیر کے مشہور سیاست دان تھے۔ انھوں نے تحریکِ پاکستان کے لیے ریاست میں بہت کام کیا۔ ۱۹۵۳ء میں شیخ عبداللہ کے بھارت سے الجھنے اور گرفتار ہونے پر ان کے ہم نوا بنے اور کئی برس قید میں رہے۔

[2]: خواجہ حبیب اللہ ککرو، تحریک پاکستان کے روحِ رواں، مشہور کاروباری ادارہ جسمن کے مالک آج کل لاہور میں مقیم ہیں۔

بارہ مُولا میں ابھی زیرِ تعلیم ہیں۔ خواجہ عزیز جُو ککرو اِس خاندان کے متمول بزرگوں میں سے تھے۔ لاہور میں حضرت شاہ محمد غوثؒ کے مزار کے ساتھ جو عالی شان مسجد ہے اُسی بزرگ کی دینی حمیت کی یادگار ہے۔ آج کل اس خاندان میں صرف خواجہ محمد مقبول ہی قابلِ ذکر ہیں جو قومی، اسلامی اور اصلاحی کاموں میں خوب دلچسپی لیتے رہے ہیں۔"[۳]

خواجہ عبدالصمد ککرو نے کاروبار سنبھالا تو بارہ مُولا کی اراضی و باغات اور دوسرے کاموں کی طرف توجہ دینے کے ساتھ ساتھ اپنے عظیم باپ کی روایات کو بھی گلے سے لگائے رکھا، بلکہ واقعات گواہ ہیں کہ ان کے بعد تعلقات کو وسیع تر ہی کرادیا۔ جس وقت خواجہ عبدالصمد ککرو نے کاروبار سنبھالا وہ دَور ریاستی مسلمانوں کے لیے بے حد اذیت ناک تھا۔ غریب دہقانوں اور محنت کشوں پر ناروا مظالم توڑے جاتے تھے۔ مسجدوں اور خانقاہوں پر پہرے لگے تھے اور اذانیں تک بند تھیں۔ دوسری طرف ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی بیداری کی تحریک چل رہی تھی۔ چنانچہ خواجہ عبدالصمد ککرو مرحوم نے ریاست میں سب سے پہلے اصلاحی تحریک کا آغاز کیا اور اپنی تحریک کا نصب العین اشاعتِ دینِ اسلام ٹھہرایا۔ جامع مسجد بارہ مُولا کی تعمیر اپنی گرہ سے کی۔ اِس ضمن میں مصنف "شبابِ کشمیر" (ص ۱۱۹) میں لکھتے ہیں:

یہ معلوم نہیں کس سال بادشاہ نے بارہ مُولا کی جامع مسجد تعمیر کی لیکن اس قدر سب مورّخ لکھتے ہیں کہ 'بنائے اُوشاز بڈشاہ بود'۔ بڈشاہی خاندان تک اس کی حالت اچھی تھی۔ چکوں کے عہد میں مسمار ہونے لگی۔ جب مغل حکومت کا یہاں دور دورہ ہوا تو اس کی از سرِ نو مرمت ہوئی۔ سکھوں کے زمانے میں شیخ محی الدین 'ناظمِ کشمیر'

۳: محمد الدین فوق تاریخ اقوامِ کشمیر ص ۲۷۵

نے اس کی چھت کو درست کیا۔ ۱۳۰۳ھ میں کثرت بارش وژالہ باری نے اس کو سر بسجود کر دیا۔ ۱۳۱۲ ہجری تک یہی حالت رہی۔ ۱۳۱۳ ہجری میں خواجہ عبدالصمد ککرو مرحوم رئیس بارہ مُولا نے اس کو پھر زندہ کر دیا۔

مرمتِ مسجد کا قطعہ تاریخ حسبِ ذیل ہے:

سجدۂ شکر سر کن اے سامع کاختر المِسا شدہ لامع
گر د اند ر بنائے مسجدِ جد خواجہ عبدالصمد زہے بامع
زدند اہلم از سرِ تعمیر گشتہ معمور مسجدِ جامع

.....۱۳۱۳ھ

خواجہ عبدالصمد ککرو مرحوم نے جامع مسجد سری نگر کی مرمت میں بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا! انجمنِ اسلامیہ، بارہ مُولا کی بنیاد رکھی اور انجمنِ اسلامیہ، قلم رُو جموں کی، جب تک زندہ رہے، امداد فرماتے رہے۔ اِسی طرح انجمنِ اسلامیہ، سیالکوٹ، کے سالانہ جلسوں میں شرکت کرتے اور چندہ دیتے۔ خواجہ صاحب مرحوم کے ایک ہم نشین اور عزیز خواجہ عبداللہ ککرو مرحوم نے چند سال بیشتر راقم الحروف کو ایک خط میں لکھا تھا:

"(خواجہ صاحب) پابندِ صوم وصلوٰۃ ہونے کے علاوہ صدقات وزکوٰۃ کی رقم یتیموں، بیواؤں اور نادار رشتہ داروں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ زیادہ تر یتیم بچوں کی تعلیم وتربیت کے دلدادہ تھے۔ مدرسۂ نصرۃ الاسلامیہ سری نگر کے بانی حضرت مولانا غلام نبی صاحب (سر سیّد ثانی) پدرِ بزرگوار الحاج مولوی محمّد یوسف شاہ صاحب مرحوم (میر واعظ کشمیر) کے دوش بدوش قلمے، قدمے اور درمے کام کرتے رہے اور مدرسہ کے لیے سری نگر اور مفصلات میں چندہ فراہم کرنے اور گورنمنٹ سے گرانٹ حاصل کرنے میں جس مستعدی اور سرگرمی سے وہ اپنا

قیمتی وقت صرف کرتے تھے دیگر رؤسا کے لیے قابلِ رشک تھا۔ بارہ مُولا میں زیرِ صدارت الحاج شیخ الحدیث، مولانا انور شاہ صاحب مرحوم ایک دینی درس گاہ قائم کی تھی، جہاں علمِ تفسیر، حدیث، فقہ اور مذہبی تعلیمِ دین جاتی تھی۔"

خواجہ عبدالصمد ککرو ریاست کے ان لوگوں میں شمار ہوتے ہیں جو اپنی اسلام دوستی، عشقِ رسولؐ اور علم پروری کی وجہ سے مشہور تھے۔ آپ خود عالمِ دین تھے اور عالموں کے قدردان بھی۔ فارسی زبان اور اُردو علوم و ادبیات میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ انگریزی زبان میں بھی گفت و شنید کر سکتے تھے۔ اپنے لوح یا کتبہ مرقد کے بارے میں فرمایا:

اگر مد برم کُن تو مقبل مرا بپاسِ محمّد شفیع الوریٰؐ
بتو ہست موجود ہر نیک و بد کلا مست صحیح است الصمد

فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں مقبل اور اُردو میں صمدؔ تخلص کرتے تھے۔ ہندوستان کے تمام بڑے بڑے ادبا اور شعرائے کرام سے ذاتی مراسم تھے اور اپنی مہمان داری اور وضع داری کے لیے ہندوستان بھر میں مشہور تھے۔ وادی میں جب بھی کوئی غیر ملکی مشاہیر آتا تو سب سے پہلے خواجہ صاحب مرحوم خوش آمدید کہتے تھے، پاس ٹھہراتے، خاطر تواضع کرتے اور عزت و احترام سے رخصت کرتے۔ مولانا محمد الدّین فوق جب بھی کشمیر جاتے تو نہایت التزام کے ساتھ خواجہ صاحب کے ہاں جاتے اور ان کے مہمان بنتے۔ چنانچہ انھوں نے کئی نظمیں خواجہ صاحب کے دیوان خانہ میں بیٹھ کر لکھیں، بلکہ کئی بار خواجہ صاحب ہی کی تحریک پر اشعار کہے۔ اس سلسلے میں "کلامِ فوق" کے صفحہ ۷۶ پر لکھا ہے:

"۲۷ ستمبر ۱۹۰۷ء کو بارہ مولا میں ان کا افتتاحی جلسہ تھا۔ سر فرانس ینگ ہسبنڈ، رزیڈنٹ اور مہاراجہ سر پرتاپ سنگھ کے علاوہ تمام اُمرا، وزرا اور اعلیٰ عہدے دار اس

جلسہ میں موجود تھے۔ خواجہ عبدالصمد صاحب ککرو، رئیس بارہ مُولا، مرحوم کی تحریک سے مہاراجہ صاحب کے بنگلہ پر ہی چند شعر میں نے لکھے:

جامۂ علم و ہنر ہر جسم کی زینت ہے آج
رشکِ دستارِ فضیلت سر پہ ہر دستار ہے
گر یہی تیری توجہ ہے تو پھر کشمیر میں
میمانِ چند دورہ نکبت و اَدبار ہے

اُسی سال فوق نے خواجہ صاحب کے دیوان خانہ میں یہ چند اشعار کہے:

کشمیر میں اسلام کا کچھ حال نہ پوچھ
غفلت ہے مسلمانوں میں غفلت سے زیادہ
تعلیم سے، تہذیب سے، تمیز سے نفرت
اُلفت ہے مگر اِن کو جہالت سے زیادہ

☆☆☆

اِس قوم میں ایسے بھی ہنر رکھتے ہیں اکثر
جو چشمِ فلک نے کبھی دیکھے نہ دکھائے
کچھ ملک کی خدمت میں کمر بستہ کھڑے ہیں
بیٹھے ہیں غمِ قوم میں کچھ سر کو جھکائے
پیدا بہت ہوگئے اللہ کے بندے
جو خواب میں ہیں ان کو بھی اللہ جگائے

خواجہ عبدالصمد ککرو موحوم ہر جمعرات کو ختم دِلاتے، درس میں شرکت فرماتے اور آنحضرت صلعم کے مولود پر مجلس منعقد کراتے۔ مقصد یہی تھا کہ اہلِ وادی اسلام کی حقیقی

روح سے آگاہی حاصل کریں۔ نہ صرف گفتار کے غازی تھے بلکہ باعمل انسان تھے۔ چنانچہ اس غرض کے لیے بارہ مُولا میں مدرسۂ فیضِ عام جاری کیا جہاں اسلامی تعلیمات کے سلسلے کا آغاز کیا۔ اس مدرسے کے اساتذہ میں برِصغیر کے بڑے بڑے عالموں اور فاضلوں کو شرکت کی دعوت دیتے اور ان کے درس و مواعظ کا انتظام فرماتے۔ آپ خود بے نظیر مقرر تھے اور عظیم الشان اجتماعوں میں دوران تقریر طبع زاد شعروں سے حاضران کو مسرور کرتے۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا انور شاہ دیوبندی سے خاص محبت اور عقیدت تھی۔ وہ اکثر آپ ہی کے پاس ٹھہرتے۔ مولانا جب دیوبند کی تعلیم اور دہلی مدرسہ کی ملازمت سے فارغ ہو کر وطن واپس آئے تو بہت افسردہ خاطر تھے۔ خواجہ صاحب مرحوم نے اس جیّد عالم اور فاضل اجل انسان کی قلبی واردات کو محسوس کر لیا اور اُسی وقت مولانا اور دیگر نو اَفراد کو ساتھ لے کر سُوئے حجاز روانہ ہو گئے۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اس قافلے کا سارا خرچ خواجہ صاحب مرحوم نے اپنی جیب سے برداشت کیا۔ حضرت مولانا انور شاہ کے ذکرِ جمیل میں مولانا محمد الدّین فوق مرحوم فرماتے ہیں:

"۱۳۴۴ھ میں خواجہ عبدالصمد ککرو رئیس بارہ مُولا اور کشمیر مردان علی رئیس گڑھی حبیب اللہ ہزارہ کی رفاقت میں زیارتِ حرمین الشریفین سے مشرف ہوئے۔ سفرِ حجاز میں طرابلسی ، بصرہ اور مصر اور بعض دوسرے مقامات کے حضراتِ علماء نے آپ کی بڑی قدر کی۔ سفرِ حجاز سے واپس آ کر خواجگان، بارہ مُولا خصوصاً خواجہ عبدالصمد ککرو کے اصرار سے آپ نے بارہ مُولا میں مدرسۂ فیضِ عام کی بنیاد ڈالی اور تقریباً تین سال تک آپ وہاں خلق اللہ کو فیض یاب کرتے رہے۔" [۱]

---

[۱] : محمد الدّین فوق مشاہیر کشمیر

خواجہ عبدالصمد ککرو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بھی رُکن تھے۔ ہر اجلاس میں شرکت فرماتے اور اپنے ہم وطنوں کی مشکلات کا تذکرہ کرتے تھے۔ آپ کا شمار آل انڈیا مسلم لیگ کے بانیوں میں ہوتا ہے کیونکہ ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں جو ابتدائی اجلاس ہوا تھا آپ اس میں شریک تھے۔ اس پلیٹ فارم سے انھوں نے حکومتِ برطانوی ہند کی توجہ ریاستی مسائل کی طرف مبذول کرائی اور اہلِ خطہ کے نکبت واَدبار سے آشنا کیا۔ انہی کے رفقائے کار خواجہ سعید الدّین شال، خواجہ نور شاہ نقشبندی، میر واعظ مولوی محمّد احمد اللہ ہمدانی اور میر واعظ مولوی رسول شاہ مرحوم نے حکومتِ برطانیہ کے وائسرائے ہند کو میمورنڈم پیش کیا اور اَذیتیں اُٹھائیں جن میں جلاوطنی شامل تھی۔ یہ بات ۱۹۲۴ء کی ہے۔ گو خواجہ صاحب کا انتقال سے قبل ہو چکا تھا مگر حقیقت یہی ہے کہ ان کشمیری رہنماؤں کا برِّصغیر کے سیاست دانوں اور دانش وروں سے تعارف خواجہ صاحب نے ہی کرایا تھا۔

خواجہ صاحب مرحوم کے تعلقات سیّد احمد خاں مرحوم، مولانا شبلی نعمانی، ڈاکٹر انصاری، مولانا حالی، حکیم محمّد اجمل خاں، نواب سلیم اللہ آف ڈھاکہ، مولانا محمّد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی، نواب محسن الملک، مولانا حسرت موہانی، مولانا مولوی سیّد میر حسن شاہ سیالکوٹی اور علامہ اقبالؒ سے اُسی دَور میں بڑھے۔ ۱۹۰۸ء میں نواب محسن الملک کا انتقال ہوا تو بقولِ فوق مرحوم ''جب یہ خبر سری نگر پہنچی تو ۲۱/اکتوبر کی سہ پہر کو خان صاحب منشی سراج الدین، میر منشی رزیڈنسی، ماسٹر صادق علی خاں، ہیڈ ماسٹر مرحوم، خواجہ عبدالصمد ککرو مرحوم اور مولوی عتیق اللہ صاحب، سیکرٹری انجمن نصرت الاسلام، سری نگر کی سعی سے اسلامیہ ہائی سکول کے وسیع صحن میں ایک جلسہ ہوا۔'' اس جلسہ میں فوق نے جو نظم پڑھی اس کے چند شعر یہ ہیں:

مٹ گیا جو رِ فلک سے قوم کا محسن بھی آج
آہ پھر گم کردہ رہ یہ کارواں ہونے کو ہے
قوم کا خادم بھی تھا سیّد بھی تھا مہدی بھی تھا
رونقِ بزمِ جہاں زیبِ جناں ہونے کو ہے

☆

کیا بتائیں ہم بقولِ داغ کیا جاتا رہا
جو بھروسہ تھا ہمیں وہ آسرا جاتا رہا

آپ کشمیری باشندہ ہونے کے باوجود انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور کے بانی رُکن تھے اور ہر اجلاس میں شرکت کرتے اور ہر بار حسبِ توفیق انجمن کی امداد فرماتے رہے۔ انجمن حمایتِ اسلام کے دیرینہ کارکن آج بھی خواجہ صاحب مرحوم کا نام بڑی عزت واحترام سے لیتے ہیں۔ سیّد نذیر نیازی فرماتے ہیں:

''خواجہ صاحب ہر سال انجمن اسلامیہ سیالکوٹ کے سالانہ اجلاس میں شرکت کرتے، مالی امداد بھی فرماتے اور تقریر بھی کرتے۔ میں نے خود ان کی تقریریں اور اشعار سنے ہیں۔''

خواجہ عبدالصمد ککرو علامہ اقبال سے سیالکوٹ سے ہی آشنا تھے، کیونکہ خواجہ صاحب کے تعلقات ان کے استادِ گرامی شمس العلما مولوی میر حسن سیالکوٹی اور ان کے والدِ ماجد شیخ انور محمد مرحوم سے تھے۔ انجمن کشمیر مسلمانانِ لاہور سے علامہ اقبال کو متعارف کرانے کا شرف خواجہ صاحب ہی کو حاصل ہے اور انہی کی تحریک پر جب اقبال بی. اے کے طالب علم تھے انھیں کشمیری مسلمانانِ پنجاب کا سیکریٹری بنایا گیا۔ اس موقعے پر علامہ اقبال نے ایک طویل نظم بھی لکھی تھی جو اُن کی لندن سے واپسی پر ''کشمیر میگزین'' میں شائع

ہوئی۔ خواجہ عبدالصمد ککرو مرحوم اور علامہ اقبال کی گہری دوستی قائم ہوگئی اور اس نوعیت کا تعلق ہوا کہ وہ علامہ اقبالؔ کے دکھ درد، مسرت و انبساط کے ہر موقع پر شریک ہوتے۔ علامہ اقبال بھی ان کے دکھ کو اپنا غم جانتے اور ان کے مسائل و معاملات کو حل کرنے کی کوشش کرتے۔

خواجہ عبدالصمد ککرو کے بڑے فرزند نے خواجہ غلام حسن، جو پابندِ صوم وصلوٰۃ اور ذہین طالب علم تھا، علامہ اقبالؒ کی زیرِ نگرانی ان کے پاس لاہور میں رہ کر میٹرک کی تیاری کی اور لاہور ہی میں امتحان دیا۔ جب اس کا نتیجہ نکلا تو علامہ اقبال نے بارہ مُولا خواجہ صاحب مرحوم کو مبارک باد کا تار دیا، مگر سوئے اتفاق سے جب تار بارہ مُولا پہنچا اُس وقت خواجہ صاحب اپنے اس جواں سال بچے کو سپردِ خاک کر کے واپس آرہے تھے۔ اس واقعہ پر خواجہ صاحب نے اُف تک نہ کی اور اعلیٰ پایہ کا شاعر ہونے کے باوجود ایک لفظ تک نہ لکھا کہ مبادا غیرتِ الٰہی جوش میں آجائے۔ صبر و تحمل سے کام لیا۔ جب علامہ اقبال کو سانحے کا علم ہوا تو خاموشی کو توڑا اور بقول شکیل:

"حالی نے زبان سے اُف نے کہی، اقبال شکایت کر بیٹھے" کے مصداق خواجہ صاحب کی حالت دیکھ کر خود خون کے آنسو بہائے۔ چنانچہ علامہ اقبال نے نے "ماتمِ پسر" کے عنوان سے نوحہ لکھا جو "مخزن" جولائی ۱۹۰۲ء میں سر عبدالقادر مرحوم کی ان سطور کے ساتھ شائع ہوا:

"ہمارے ایک عنایت فرما رئیسِ بارہ مُولا، علامہ کشمیر، خواجہ عبدالصمد ککرو ہیں۔ اُنھیں چند ماہ ہوئے اپنے چہیتے ہونہار بیٹے کی مرگِ ناگہاں کا داغ دیکھنا نصیب ہوا خواجہ صاحب ذی علم اور علم دوست رئیس ہیں اور خود زبانِ فارسی میں طباع شاعر ہیں اور مقبل تخلص کرتے ہیں مگر اس رنج نے ان کی طباعی اور زندہ دلی پر پانی پھیر دیا ہے اور

انھیں تصویرِ غم بنا دیا ہے۔ شیخ محمد اقبال صاحب نے ان کی طرف سے مرحوم کا نوحہ لکھا جو درج ذیل ہے:

اندھیرا عدم کا مکاں ہو گیا — وہ خورشید روشن نہاں ہو گیا
بیاباں ہماری سرا بن گئی — مسافر وطن کو رواں ہو گیا
گیا اُڑ کے وہ بلبلِ خوش نوا — چمن پائمالِ خزاں ہو گیا
نہیں باغِ کشمیر میں وہ بہار — نظر سے جو وہ گل نہاں ہو گیا
گیا کارواں اور میں راہ میں — غبارِ رہِ کارواں ہو گیا
گرا کٹ کے آنکھوں سے لختِ جگر — مرے صبر کا متحاں ہو گیا
بڑھا اور اک دشمنِ جاں ستاں — دھواں آہ کا آسماں ہو گیا
ستم اس غضب کا خزاں نے کیا — بیاباں مرا بوستاں ہو گیا
ہوئی غم کی عادت کچھ ایسی مجھے — کہ غم مجھ کو آرامِ جاں ہو گیا
کسی نوجواں کی جدائی میں قد — جوانی میں مثلِ کماں ہو گیا
جدائی میں نالاں ہوں بلبل نہ کیوں — وہ گل زیبِ باغِ جناں ہو گیا
وہ سرخی ہے اشکِ شفق رنگ میں — حریفِ مئے ارغواں ہو گیا
بنایا تھا ڈر ڈر کے جو آشیاں — وہی نذرِ برقِ تپاں ہو گیا
کروں ضبط اے ہم نشیں کس طرح — کہ ہر اشک طوفاں نشاں ہو گیا
غضب ہے غلامِ حسن کا فراق — کہ جینا بھی مجھ کو گراں ہو گیا

اقبال

دیا چین کے وہ غم فلک نے اُسے
کہ مقبل سراپا فغاں ہو گیا

اس ضمن میں مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

"خواجہ عبدالصمد قومی کاموں میں سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ انجمن کے جلسوں میں آتے تھے تو خوب چندہ دیتے تھے۔ خود بھی تقریریں کرتے تھے۔ نیز شاعروں اور مقرروں کی حوصلہ افزائی میں بھی سب سے پیش پیش رہتے تھے۔ اقبال سے انھیں بے حد محبت تھی۔ اقبال نے اسی تعلق کی بنا پر یہ نوحہ کہا تھا جو خواجہ عبدالصمد کی زبان سے ہے۔ خواجہ غلام حسن مرحوم کا نام تھا۔" [1]

خواجہ عبدالصمد ککرو کو علامہ اقبال سے کسی قدر عقیدتِ واردات تھی۔ اس کا اندازہ انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور کے اٹھارویں سالانہ جلسہ ۲۷ تا ۲۸ فروری ۱۹۰۳ء یکم مارچ ۱۹۰۳ کی روداد سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے تیسرے اجلاس میں جو جناب خان بہادر غلام احمد خان صاحب مشیرِ مال، ریاست جموں و کشمیر کی صدارت میں ہوا، ڈاکٹر علامہ اقبال نے "فریادِ اُمت" کے عنوان سے نظم پڑھی۔ چنانچہ اس سلسلے میں روداد ۱۹۰۳ء میں لکھا ہے:

"اقبال صاحب کو جیسی خدا نے لیاقت عطا فرمائی ہے ویسے ہی قدرت نے ان کو گلا بھی عطا کیا ہے اور ایسی بلند اور شیریں اور پُر درد آواز کی نعمت مرحمت کی ہے جو اُنھیں کا حصہ ہے۔ اس قدرتی عطیہ کی امداد سے ان کے کلام کو جو فی ذاتہ نہایت عمدہ اور پُر معنی ہوتی ہے اثر دوبالا ہو جاتا ہے۔ اس نظم کے پڑھے جانے پر لوگوں نے چندہ دیا اور پانچ روپے فی کاپی خریدی۔ چنانچہ اِس قابلِ دید نظم کے بہت سے نسخے فروخت ہو گئے۔ خواجہ عبدالصمد ککرو نے شیخ محمد اقبال صاحب کو اس نظم کے صلے میں ایک نقرئی تمغہ پہنایا جو خواجہ صاحب کشمیر سے بنوا کر لائے تھے۔ [2]

---

۱ : سرودِ رفتہ ص ۱۶۵

۲ : محمد حنیف شاہد اقبال اور انجمنِ حمایتِ اسلام ص ۷۸

سیّد نذیر نیازی نے راقم کو بتایا کہ جب حضرت علامہ اقبال نے اپنی نظم ''شکوہ'' پڑھی تو اس کے اختتام پر خواجہ عبدالصمد ککرو جو جلسہ گاہ میں موجود تھے اور ایک بیش قیمت کشمیری شہ توشہ (شال) اوڑھے ہوئے تھے اپنی جگہ سے اُٹھے اور وہ شال حضرت علامہ کے شانوں پر ڈال دیا اور فرطِ جذبات سے حضرت علامہ سے بغل گیر ہو گئے۔ ازاں بعد اس شال کو جلسہ گاہ میں نیلام کیا گیا۔ روپیہ انجمن کے چندہ میں دے دیا گیا۔

خواجہ عبدالصمد ککرو پچاسی سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ علامہ اقبال ۱۹۲۱ء میں جب کشمیر گئے تو تعزیت کے لیے بارہ مُولا گئے۔ علامہ اقبال نے ایک بار اُن کے بارے میں فرمایا:

خواجۂ خواجگان صمد ککرو　　آنکہ دار قیام در کشمیر

.... ☆ ☆ ☆ ....

کشمیری لوک اَدب اور لوک گیت

ہر ایک زبان کے تخلیقی اَدب کی رنگارنگی کا تعلق بہت حد تک اُس زبان کے لوک اَدب کے ساتھ ہوتا ہے یعنی تخلیقی اَدب کی بنیادیں لوک اَدب کی ہی بنیادوں پر اُستوار ہُوا کرتی ہیں اور اِس کی گہرائی، وسعت، مٹھاس اور تہہ داری میں بہت حد تک لوک اَدب کا ہی حصّہ ہوتا ہے۔ اور یہی لوک ادب تخلیقی اَدب کو مالا مال کر کے گویا ایک طرح کا سہارا مہیا کرتا ہے۔

تخلیقی اَدب کی جو شکلیں اور اَوصاف اِنسانی فطرت کے زیادہ قریب اور قبولِ خاطر ہوتی ہیں وہ زیادہ تر لوک اَدب سے ہی حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اور اس کی مقبولیت کے اَسباب عام طور پر لوک اَدب سے ہی حاصل کی جا سکتی ہیں اِس کی مقبولیت کے اَسباب عام طور پر لوک اَدب کی ہی گود میں پلکر نمایاں ہوتے ہیں۔ اِس لئے لوک اَدب کا پلڑا ہمیشہ بھاری ہوتا ہے۔ اِس کی جڑیں کئی صدیوں کی زمین کی گہرائیوں میں پیوست ہوتی ہیں اور صدہا سال کی چھاتیوں سے دُودھ پی کر چھلنی سے نتھر کر مضبوطی، قوّت اور حُسن و خوبی پا کر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اِس لئے اِس پودے کو جو وقت اور زمانہ کی رفتار کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے ایک وُسعت اور پھیلاو والے درخت کی صورت اختیار کرتا ہے اور یہ ہر زمانے کی نت نئی ایجادات اور سائینسی دریافتوں اور ترقّیوں اور پھر کامیابیوں اور ناکامیوں کا رَس پی کر پھلتا اور پھُولتا رہتا ہے اور دِن بدن اُپنے دامن کو وسیع کرتے ہوئے نئے معلوماتی اور اَدبی جواہرات سے مالا مال کرتا ہے اور نئی نئی شکلیں پا کر اُپنا وجود منواتا رہتا ہے اور قبولیتِ عوام کی تحسین و آفرین پاتا رہتا ہے۔ یہی کشمیری لوک اَدب کی خاصیت ہے۔

اِس میں اَپنی رنگارنگی، خود آگاہی اور مثالی تصویر کشی کس پائے کی ہے؟ جناب محمد یوسف ٹینگ صاحب یوں رقمطراز ہیں۔

''کشمیری لوک گیت.....ساتھ ہی لوک اَدب کے اور اَصناف اور انکی اصلیت پَرکھنے کے لئے یہ بات زیرِ نظر رکھنی چاہئے کہ کشمیریوں کے لطیف احساسات اور عقل و دانشِ کے قطرے جب چھلنی سے چھان کر حروف کی صراحیوں میں بھرتے جاتے تھے تو اُس وقت وہ ''کشیر'' کے نام سے پُکارا کرتے تھے۔ ایک وطن جو اَلگ ماخود کفیل اور خود بذات تھا۔ اِسی لئے وہ وُلر جھیل کو ''سدُر'' (یعنے سمندر) کہتے تھے اور پیر پنچال کو کیلاش پربت تصوّر کرتے اور تسلیم کرتے تھے وہ اِنہی شیشہ کے نگ والی انگوٹھیوں کو جامِ جم بنا کر تمام دُنیا کا نظارہ کرتے تھے۔ اِس لئے یہ لوک اَدب کی مختلف شاخیں ایک پوری تہذیب کا پتہ دیتی ہیں۔ اِس میں جو چیز محفوظ ہے وہ اِس صاف وشفاف اور حسین انداز میں کسی اور جگہ نظر نہیں آئے گی''[1]

جارج گریرسن نے یُونہی تو نہیں کہا تھا کہ دنیا کے بہت کم ممالک کی زبانوں میں اسقدر عقل و دانش کی باتیں یعنی کہاوتیں ہونگی جتنی کشمیری زبان میں ہیں ہر زبان کے لوک اَدب میں اَپنے اَپنے ماحول اور گِرد و پیش کے حالات کے مطابق اَپنی اَپنی مختلف شکلیں اور رنگ ہوں گے۔ مگر کشمیری لوک اَدب میں جس قدر رنگارنگی اور وُسعت ہے مشکل ہی سے دُنیا کی کسی اور زبان میں اتنے پھیلاؤ وُسعت اور رنگارنگی کے ساتھ لوک اَدب نے وجود پا کر ترقی پائی ہو۔ آر اَیل سٹائن لکھتے ہیں:-

"My intrest had been aroused from the first of the rich store of popular love which Kashmiri presents in the folk tales, songs, prouds and the like"

یعنی ''اُسے کشمیری زبان کے لوک اَدب کی دل چسپی میں اِس کی لوک کہانیوں، لوک گیت اور ضرب الامثال کا مالا مال خزانہ دیکھ کر اضافہ ہوا تھا۔''

☆ لکہ باٹھ جلد ۸ صفحہ ۶ [2] کاشر شرچ کتاب صفحہ ۱۷

کشمیری لوک اَدب کا جو سرمایہ اَب تک جمع کیا گیا ہے۔ اور اِس کی الگ الگ قسمیں جو تحقیق و تلاش کے بعد زیورِ تحریر و ترتیب سے آراستہ ہوئی ہیں اس کام میں جموں و کشمیر اکادمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز کا خاصا حصہ ہے۔۔۔ پہلے جو کچھ بھی کام اس سلسلے میں ہوا تھا اُس میں نولز (J.H.Knowls) کی کتاب A Dictionar of Kashmiri Proverbs and sayings جو ۱۸۸۵ء میں ممبئی میں چھپی ہے۔ اِس کے بعد آر ایل سٹائن کی جمع ہوئی اور جارج گریرسن کے ہاتھوں ۱۹۱۲ء میں پہلی بار طبع شدہ کتاب "Hatams tales" ہے جو ۱۹۲۲ء میں دوبارہ طبع ہوئی تھی۔ یہ دونوں رومن رسمِ خط میں ہیں اور انگریزی ترجمہ ساتھ رکھا گیا ہے۔ اِس کے بعد بھی کچھ انگریزی ترجمہ ساتھ رکھا گیا ہے۔ اِس کے بعد بھی کچھ انگریزی رسالے وغیرہ بھی لوک ادب کے مختلف رنگوں یا شکلوں کے سلسلے میں شائع ہوئے ہیں۔ صرف ایک رسالہ ''کاشُرِ مثالہ'' (کشمیری مثالیں) کے نام سے نور محمد بک سیلر کے اہتمام سے کشمیری زبان میں اُردو رسم خط میں چھپا ہے اور یہ سب چیزیں اَب بہت کم یاب ہیں۔

۱۹۶۲ء میں ایک انگریزی کتاب A wit of Kashmir کے نام سے چھپی ہے۔ یہ ایک ملی جلی کتاب محاوروں اور ضرب الامثال وغیرہ کی ہے۔ اور اس کے ترتیب کار جناب محمد الدین حاجی نے ایک کتاب لکھی ہے۔ ''کاشُرِ نثرچ کتاب (کشمیری نثر کی کتاب) نام سے اسمیں لوک اَدب کی مختلف شکلوں کے کچھ نمونے جمع کئے گئے ہیں۔ اور پھر انکی ہی ایک کتاب ''لُکہ رَس'' (Fdk lore) کے نام سے طبع ہوئی ہے۔ اِس کے بعد جو کچھ بھی مواد اِس سلسلے میں چھپا ہے اس کا اکثر حصہ کلچرل اکادمی جموں و کشمیر کے اہتمام سے صرف کشمیری میں ہی چھپا ہے۔ جسکی تفصیل یوں ہے۔

نمبر شمار	نام کتاب معہ اُردو ترجمہ	کتنی جلدیں	سال طباعت
۱۔	کاشرِ لُکہ باہتھ (کشمیری لوک گیت)	۱۰ جلد	۱۹۶۵ء تا ۱۹۸۹ء

۲۔ کاشرِ لُکہ کتھ (کشمیری لوک کہانیاں) ۵ جلد ۱۹۷۲ء تا ۱۹۸۹ء

۳۔ سانہِ گندن ترایہ (ہمارے کھیل) اجلد ۱۹۷۹ء

۴۔ کاشرِ تلمیح (کشمیری تلمیحات) اجلد ۱۹۸۵ء

۵۔ کاشری دیپتھ (کشمیری کہاوتیں) اجلد ۱۹۸۸ء

اِس کے علاوہ ہمارا اَدب لوک اَدب نمبر اور "سون اَدب" (ہمارا اَدب) کشمیری اور رسالہ شیرازہ کے لوک اَدب نمبر بھی خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ کشمیر یونیورسٹی کے کشمیری ڈیپارٹمنٹ نے لوک اَدب پر کئی سیمینار کئے اور اِن میں پڑھے گئے اِس سلسلے میں لکھے گئے کئی مقالات اِس کے رسالہ "انہار" میں شائع ہوئے ہیں جو بہت اعلےٰ پائے کی تحقیق سے تعلق رکھتے ہیں۔

کشمیری لوک اَدب کے جو اَقسام و اَصناف اَب تک سامنے ہیں اُن میں لوک گیتوں کا ایک بڑا اور اَہم حصّہ ہے جن کے بارے میں ہم آج ذرا تفصیل کے ساتھ بات کریں گے۔ لُکہِ باَتھ یا لوک گیتوں کے مختلف اقسام ہیں۔ گنڑِ باشیہ چھوٹے بچے کو آواز اور زبان کی تربیت دی جاتی ہے کہ اُسے چھوٹے چھوٹے ہم وزن جملے چھوٹے بچوں کی ہی زبان میں گوش گذار کئے جاتے ہیں۔ ایک بچہ خاموشی کے ساتھ سنتا ہے اور اگر روتا ہُوا ہو تو عموماً یہ جُملے سن کر چُپ سادھ لیتا ہے۔ اصل میں لوک گیت یہ ہیں۔

(۱) مَنزِلی باَتھ (جھولے کے گیت) جب بچہ ذرا بڑا ہو جاتا ہے اور جھولے وغیرہ میں سلایا جاتا ہے تو اُس کے لئے گیت یا لوریاں کشمیری زبان میں ہیں جو قدیم زمانے سے وجود پا گئی ہیں۔ اِن گیتوں کے ذریعے سے بچوں کی فطرتِ اَزل سے ہی جذبۂ محبت سے تعمیر کی جاتی ہے۔ اور درجہ بدرجہ اُس میں اس قدر اہلیت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ وہ آگے آنے والے مراحل سہولیت کے ساتھ طے کرتا ہوا زندگی کی جدوجہد میں اُسے ایک لُطف اور لذت محسوس ہو اور یہ زندگی پیاری اور حسین محسوس کرنی اُس کے لئے ممکن ہو۔ ماں اور باقی تمام بزرگوں کی محبت اور چاہت اُسے حاصل ہو اور اُس کی

نفسیات بھی اطمینان اور سکون کی بنیاد پر تعمیر ہو اور خوشحال اور مطمئن رہتے ہوئے نشو ونما پائے۔ اسمیں خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے گیتوں میں کسی فنی بلندی کا ہونا ضروری نہیں کیونکہ ان میں صرف بچے کی خاطر جذبات اور زبان کی صفائی اور مناسب حال انداز بیان اور دلکشی ہوتی ہے۔ ایک نمونہ سُنئے۔ ماں بچے کے لئے کیا چاہتی ہے اور اُن جذبات کو کون سی زبان دیتی ہے۔ ایک دو اشعار ایک بڑے گیت کے سُنئے۔

اللہ اللہ رچھُونے مولا

رَچھُونے مولا بیہ حق تعالا

بابن اوَن یونابد تعالا

اَللہ اَللہ رَچھُونے مولا

ترجمہ اللہ اللہ تجھے مولا پالے اور بچائے۔ تجھے مولا بچائے اور حق تعالےٰ محفوظ رکھے باپ نے تیرے لئے نبات سے بھر کر تھال یا پلیٹ لائی۔ اللہ اللہ تجھے مولا بچائے یہ گیت بچے کے دو ہاتھوں کو اَپنے دو ہاتھوں میں پکڑ کر بچے کو آگے پیچھے حرکت دے کر گایا جاتا ہے۔

(۲) شُرُو باتھ (بچوں کے اَپنے گیت) جھولے کے گیتوں کے بعد بچوں کے اَپنے گیتوں کا نمبر آتا ہے بچہ خود چلتا پھرتا اور کھیلتا رہتا ہے۔ وہ خود اَپنی وہ ضرورتیں پوری کرنا چاہتا ہے۔ جس کا وہ اب تک محتاج رہا یا جنہوں نے اُس کا ذہن ترنم آگاہ اور سرور ونغمہ کا دِلدادہ بنا دیا تھا۔ اِس دور میں بھی وہ اپنے بڑوں اور بزرگوں سے مدد لیتا ہے۔ اور اَپنے رشتہ داروں کے بچوں سے بھی جنہوں نے یہ بچوں کے گیت اُسے پہلے ہی وراحت کے طور پر حاصل کئے ہوئے ہیں۔ مختلف مواقع اور محل اور حالات وضروریات انکی تخلیق میں مدد دیتے ہیں اور یاد رکھنے میں بھی مثلاً بادل چھا جائیں اور بچے جانتے ہیں کہ مطلع صاف ہونا خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ خدا کو اَپنے ہی ذہن کے مطابق خوش کرتے ہیں. اور کہتے ہیں۔

خدایا تاپھ کر صاف کو کُر مارَے"

یعنی اے خدا سورج نکال اور میں تیرے لئے صاف مُرغ ذبح کروں گا۔ اسی طرح وہ بچے اپنے اپنے موقع و محل کے مطابق پیش آنے والے حالات کو وزن دار جملوں میں اظہار کر کے ایک شعری ہیئت بخشتے ہیں جن میں سماج نے بچے کے لئے تعلیم مہیا کی ہے کہ خوشی کے لمحات کس طرح مل جُل کے گزارنے چاہئیں۔ شعور ایک رہنمائی پاتا ہے اور قوتِ برداشت بڑھ جاتی ہے جسمیں آگے آنے والے غم و اندازہ کے لمحات اور انقلابات کی تاثیر برداشت کرنے کی گنجائش نکلتی ہے۔ دوسری طرف تعمیری کاموں کی ذہنیت تعمیر ہونے کی بنیاد اُستوار ہوتی ہے۔ جس میں بچہ حتی الامکان خوشحالی کے ساتھ سماج کا زندہ اور کارآمد فرد بن سکے۔ آئندہ زندگی کی جدوجہد میں پیش آنے والے مراحل طے کرنے اُس کے لئے آسان ہو جائیں اور وہ آگاہ ہو جائے کہ کوئی کام انجام دینے کے لئے کتنے رنگا رنگ مراحل طے کرنے ہوتے ہیں۔ اور ہر حال میں ماحول اور برادری بھولنے نہ پائے۔ ایک گیت اس قسم کا سنئے۔

نانیہ دیتم دانے
نانی نے مجھے دھان دیا
دانیہ دتم کنزس
دھان میں نے پتھر کی اُوکھلی ۱ کے حوالے کیا
کنزن دیتم تومل
اوکھلی نے مجھے چاول دیئے
تومل دیتم گرلس
چاول میں نے گھراٹ کو دیئے

---

۱ آجکل تو دھان کوٹنے والی مشینیں ہیں۔ چند سال پہلے تک بلکہ اب بھی کہیں کہیں دھان پتھر کی اوکھلی میں کوٹا جاتا ہے۔

گرہٹس دیتم اوٹ

گھراٹ نے مجھے آٹا دیا

اُوٹ دیتم ڈل سے

آٹا میں نے دولچی کو دیا

ڈلچہ دِتَرم ژوٹ

ڈولچی نے مجھے آٹے کا پیڑا دیا

میہٹ وَترم تاوے

وہ پیڑا میں نے توے کو دیا

تاوِ دِتَرم ژوٹ

تَوے نے مجھے روٹی دے دی

ژوٹ دِترم ماسس

روٹی میں نے ماما جی کو دے دی

مامن باگراو گاسس

ماما جی نے سارے گاؤں میں بانٹ دی

اتنی محنت کے بعد ماما جی نے بچے کو گاؤں والوں یا ہمسایوں اور سماج کے ساتھ مساوات اور ہمدردی کا سبق دیا، اور بچے کو یہ احساس جاگ اُٹھا اور یقین ہو گیا کہ میری ساری کمائی اور محنت کے حصول میں میرے سب گاؤں اور برادری کے لوگ شریک ہیں۔ اور ہمسایہ پروری اور انسان اقدار کی عظمت کے لئے اپنے آپ کو ہمیشہ تیار رہنے کا سبق حاصل کیا۔

(۳) وَن وُن (عورتوں کے گیت جو عموماً شادی بیاہ پر گائے جاتے ہیں)

یہ لوک گیتوں کا سب سے بڑا اور میٹھا اور پُرسرور حصہ ہے اور اس کے مختلف حصّے میں مگر وَن وُن ایک مقررہ زمین یا بحر میں اَزمنۂ قدیم سے تخلیق ہوتا آیا ہے۔ اور خاص بات یہ ہے ہندو عورتیں جو گیت شادی بیاہ کے موقعوں پر گاتی ہیں وہ اُسی زمین میں ہوتے ہیں

لیکن اُن کے گانے کا طریقہ بہت سُست اور لمبی آواز میں گانے کا ہے۔ جبکہ مسلمان عورتیں تیز اور کھلی زبان میں گاتی ہیں۔ اور اب ہندو لوگ بھی اپنی شادی بیاہ کے موقعوں پر اور خاص کر اُن مواقع پر جب دولہا سسرال کو جاتا ہے اور جب دُلہن لیکر آتا ہے اور جب دُلہن میکے سے سسرال کی طرف روانہ ہوتی ہے مسلمان عورتوں کا ''وَن وُن'' پسند کرتے ہیں۔ اور اُنہی کو لا کر اُن سے گواتی ہیں اب ہندو لڑکیاں بھی اُن مسلمان عورتوں کے ساتھ مل کر انہی کی طرح گانا پسند کرتی ہیں۔ اس ونوُن کی بحر بے بحر متدارک شانزدہ رُکنی مطموس الآخر یعنے، فاعلن، فاعلن، فاعلُن، فاعلُن، فاعلُن، فاعلُن، فاع مثلاً تقطیع بسملا فاعلن، کارتھِ فاعلن، ہمبے وَن فاعلن، ووئے فاعلن، صاُ جن فاعلن، آنجام فاعلُن، اونو فاعلن، پائے فاع اِسی حساب سے تقطیع ہوسکتی ہے۔ حروبِ علّت یعنے ا، واوری جب آواز کے طور پر استعمال ہوتے ہیں تو یہ عموماً لمبے کئے جاتے ہیں۔ مثلاً کُرتھ، کو کارتھ، وُنے کو وونے انجام کو آنجام، اون، اونو، بلے، کو یائے، پڑھایا گایا جاتا ہے۔ اِس کی کئی اقسام ہیں۔ یعنی ہر موقع کے لئے ایک الگ الگ وَنوُن گایا جاتا ہے اور کئی اشعار ہر موقع پر برتنے کے قابل ہوتے ہیں۔ مثلاً بسملاہ کارتھِ ہمبے ونو ونے صاُ حبن آنجام اونو یآے یعنی بسم اللہ کر کے میں گانا شروع کروں گی کہ صاحب یعنے خدا نے (کارخبر) کو تکمیل تک پہنچایا یا وہ کارخبر کو اچھے انجام تک پہنچائے یہ دونوں معنی اِسے حاصل ہوتے ہیں۔

یہ بات خاص طور پر یاد رکھنی چاہئے کہ لوگ گیت اُردو یا فارسی کی مقررہ بحروں میں مکمل طور پر تو پورے نہیں اُترتے کیوں کہ یہاں آوازوں کے پھیلنے اور سکڑ جانے کی صورت پیش آتی ہے اور عورتیں یا مرد یا بچے اَپنے اَپنے مواقع کے مطابق گیتوں میں الفاظ کو آوازوں کے بنا کر اَدا کرنا جانتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے اُوپر دکھایا ہے۔

''وَنوُن'' کی موقع ومحل کے مطابق کئی قسمیں ہیں۔ اِس سلسلے میں انشاءاللہ آئندہ بات ہوگی۔

☆✶☆

شہاب عنایت ملک

شاعرِ تاجدار، بہادر شاہ ظفؔر

ابوالمظفؔر بہادر شاہ ظفؔر ۱۴؍اکتوبر ۱۷۷۵ء کو ایک شاہی خاندان میں تولّد ہوئے۔ اکبر شاہ ثانی کی گیارہ اولادیں تھیں جن میں ظفؔر سب سے بڑے تھے۔ ظفؔر کی تعلیم اعلیٰ طرز پر ہوئی۔ قرآن شریف کے علاوہ عربی اور فارسی زبانوں سے بھی آشنائی کرائی گئی۔ بہادر شاہ ظفؔر وہ مغل تاجدار تھے جنہوں نے قوم وملّت کی بے پناہ خدمات انجام دیں اور قوم کی خاطر اپنی اولادیں اور خاندان کے دیگر افراد کو بھی قربان کر دیا۔ دوسری طرف چونکہ شروع سے ہی اُن کا ذہن ادب کی طرف مائل تھا یہی وجہ ہے کہ بحیثیتِ شاعر بھی وہ اُردو ادب میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔

۱۸۳۸ء میں اکبر شاہ ثانی کی موت کے بعد ابوالمظفؔر متخلص بہادر شاہ ظفؔر کو تخت کیا گیا لیکن یہ تخت نشینی برائے نام کی تھی۔ وقت، بادشاہت کو کافی پیچھے چھوڑ چکا تھا اور ایک نیا عہد افق پر نمودار ہو رہا تھا جسے تاریخ کے اَوراق غلامی کے دَور سے مُتصف کرتے ہیں۔ دراصل بہادر شاہ ظفؔر کی تاج پوشی اس عہد میں ہوئی جب ملک اور قوم انگریزی تسلّط کی شکار تھی۔ ملک بھر میں قتل وعام کا سلسلہ شدت کے مراحل میں داخل ہو چکا تھا۔

بادشاہ کی حیثیت ایک وظیفے خوار سے کچھ زیادہ نہ تھی۔ کمپنی بادشاہوں کو وظیفے کے ساتھ ساتھ قلعہ کی چار دیواروں تک محدود رہنے کا مشورہ بھی دیتی رہتی تھی ۔ وظیفہ خوار بادشاہت کا سلسلہ شاہ عالم کے دور سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ شاہ عالم اور اکبر شاہ ثانی کے بعد بہادر شاہ ظفر نے بھی اپنی زندگی کمپنی کی عنایتوں اور مہربانیوں پر ہی گذاری اور اپنی طاقت اور بادشاہت کو لال قلعہ تک ہی محدود رکھا۔

اگر چہ مغلیہ حکومت کی قدر و اقتدار تین پیڑھیوں پہلے سمٹ چکی تھی اور مغلیہ سلطنت اب لال قلعہ تک ہی محدود ہو کر رہ گئی تھی لیکن اس کے باوجود انگریزی اپنی گندی سیاست سے چالیں چلنے میں مصروف تھے۔ وہ اپنے مقاصد کو حل کرنے کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کر رہے تھے۔ اُن کا مقصد مغلیہ سلطنت کو جڑ سے اُکھاڑنا تھا یہی وجہ ہے کہ جہاں انگریزی سرکار بادشاہوں کو مراعات دیتی تھی وہیں دوسری جانب اُنہیں غلامی کا احساس بھی دلاتی تھی اور اُن سے کیئے ہوئے معاہدوں پر قائم نہ رہ کر خلاف ورزی کرتی رہتی جس کی وجہ سے شاہان مغلیہ اور برطانوی سامراج کے درمیان آئے دن رنجشیں بڑھتی جا رہی تھیں ۔ کمپنی نے بادشاہوں کے ساتھ غُلاموں جیسا برتاؤ شروع کر دیا تھا۔ بہادر شاہ ظفر جب تخت نشین ہوئے تو اس کے فوراً بعد کمپنی سے پنشن میں اضافے کی مانگ کی۔ بہادر شاہ ظفر کی مانگ کے سامنے انگریزوں نے سر خم تو کیا لیکن اس مطالبے کی وجہ سے انگریزوں کے اندر غصے کی آگ مزید بڑھتی گئی۔

انگریزوں کے ظلم و تشدد اور استحصال سے عوام کے اندر بھی ایک ذہنی اضطراب نمو پا رہا تھا جو ۱۸۵۷ء کے غدر کی صورت میں سامنے آیا۔ یہ غدر انگریزوں کے جبر اور زور زبردستی کا ہی نتیجہ تھا۔ غدر کی یہ آندھی میرٹھ سے لے کر دہلی تک کو اپنی زد میں لے لیتی ہے۔ میرٹھ میں انگریزی فوج کی ایک باغی ٹکری نے آزادی کا نعرہ بلند کیا جس کی

گونج دہلی تک آ پہنچی۔ فوج کی اس ٹکری نے مدد کے لیے دہلی کا رخ کیا اور بادشاہ کی سلامتی کے نعرے بلند کرتے ہوئے لال قلعہ میں داخل ہو کر بہادر شاہ ظفر سے امداد اور سرپرستی کی خواہش ظاہر کی۔ اب چونکہ مغلیہ حکومت عزت اور دولت سے محروم ہو چکی تھی اور فوجی ارباب کا بھی خاتمہ ہو چکا تھا ظفر ان تمام حالات پر نظر رکھے ہوئے تھے جس کی بنا پر ظفر نے اپنی مایوسی کا اظہار کچھ ان الفاظ میں کیا۔

سنو بھائی مجھے بادشاہ کون کہتا ہے میں تو فقیر ہوں ایک تکیہ بنائے اپنی اولاد کو لیے بیٹھا ہوں۔ بادشاہت تو بادشاہوں کے ہمراہ گئی سلطنت تو سولہ برس پہلے میرے گھر سے جا چکی ہے۔ میرے پاس خزانہ نہیں ہے کہ تم کو تنخواہ دوں فوج نہیں کہ تمہاری مدد کر سکوں۔ ملک نہیں کہ تحصیل کے لیے نوکر رکھوں" [1]

بادشاہ کی ان تمام باتوں کے باوجود مجاہدین آزادی نے ان کی خالص سرپرستی پر اکتفا کیا اور بادشاہ کی سلامتی کے نعرے بہ آواز بلند لگانے شروع کر دیے جس سے ظفر کا تیموری خون جوش میں آ کر جنگ آزادی کے میدان میں کود پڑا۔ بہادر شاہ ظفر قلعہ کی دیواروں کو پھلانگ کر مجاہدین آزادی کا حوصلہ بڑھانے لگے جس کے نتائج ہولناک ثابت ہوئے۔ انگریزوں نے بڑی آسانی سے بغاوت کو ناکام کر دیا۔ بغاوت فرو کر کے انگریزوں نے بڑی ہولناک کی سے ظلم و ستم، جبر و تشدد اور لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ دہلی پر انگریزوں نے اپنے پرچم لہرائے اور کھلے عام لوگوں کو پھانسیاں دی جانے لگیں۔ قتل و غارت کا یہ سلسلہ سات دنوں تک جاری رہا۔ نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد کو پھانسی پر چڑھایا گیا۔ بہادر شاہ ظفر نے بھی فرار کی راہ اختیار کی اور کئی دنوں تک ہمایوں کے مقبرے میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ پناہ لی۔ بالآخر اُن کو شہزادوں اور بیگمات کے

ساتھ گرفتار کرلیا گیا اوران پر مقدمہ چلایا گیا۔ پہلے تو ظفر کے لئے پھانسی کی سزا مقرر کی گئی لیکن بدامنی کے ڈر سے رعایت کے طور پر اُنہیں جلا وطن کر کے رنگون بھیج دیا گیا لیکن بہادر شاہ ظفر کو تمام اولادوں کا قتل اپنی آنکھوں سے دیکھنا پڑا۔ یہ ظلم کی انتہا تھی کہ ہمایوں کے مقبرے پر میجر ہڈسن نے مغل شہزادوں کو گرفتار کرلیا اوران کو دہلی کے خونی دروازہ پر گولی کا نشانہ بنا کر اُن کا خون پیا۔ ایسا غیر انسانی رویہ اور بربریت کی مثال تاریخ میں کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔ شہزادوں کی موت سے متعلق غلام احمد فرقت نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:۔

''جس وقت شہزادے ہڈسن کے پاس آئے اس نے ان کو خونخوار نظروں سے دیکھا مگر خاموش کھڑا رہا اور رتھوں میں سوار ہو جانے کا حکم دیا۔ شہزادے سوار ہو گئے تو ہڈسن ان کو محاصرہ میں لے کر دہلی کی طرف روانہ ہوا اور جب دہلی ایک میل رہ گئی تو رتھوں کو ٹھہرایا اور شہزادوں کو حکم دیا کہ رتھوں کے باہر آجائیں اور اپنے کپڑے اتار ڈالیں، شہزادوں نے یہ حکم سن کر آپس میں ایک دوسرے کو دیکھا ان کو یہ اُمید ہرگز نہ تھی کہ ان کو اسی جگہ قتل کیا جائے گا۔ کیوں کہ مرزا الٰہی بخش نے ان سے کہا تھا کہ جنرل ولسن کے اختیار میں یہ فیصلہ ہے بادشاہ کی طرح تم کو بھی جان کی امان دے دے گا۔ ہڈسن صاحب کو نہ امان دینے کا اختیار ہے نہ قتل کرنے کا۔ مگر جس وقت ہڈسن نے ان کو رتھوں سے باہر آنے اور کپڑے اتارنے کا حکم دیا تو وہ اس کی وجہ بالکل نہیں سمجھے اور ایک دوسرے کو حیرت اور تعجب سے دیکھنے لگے۔

آخر وہ رتھوں سے اترے اور انہوں نے اوپر کے لباسِ شہزادگی کو جسم سے جدا کر دیا اور ہڈسن کو دیکھنے لگے کہ اب کیا کہتا چاہیئے، ان کو خیال تھا کہ شاید یہاں سے وہ ہم کو قید کر کے پیدل لے جانا چاہتا ہے۔ یہ بات تو ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھی کہ وہ اِسی جگہ قتل کئے جائیں گے۔ ہڈسن نے جب ان کو لباسِ شہزادگی اتارے ہوئے کھڑے دیکھا تو وہ غصے میں دیوانہ ہو گیا اس نے ایک سوار سے بھری ہوئی قرابین مانگی اور اس کو ہاتھ میں لے کر تڑ تڑ تین فیر کئے گولیاں شہزادوں کے سینے میں لگیں! اور وہ ہائے دھوکا کہہ کر زمین پر گر پڑے اور خاک میں لوٹنے لگے اور کچھ دیر بعد مر گئے۔ ہڈسن ان کے تڑپنے اور خاک و خون میں لوٹنے کو خوشی کے چہرے سے کھڑا ہوا دیکھتا رہا اور جب وہ مر گیئے تو ان کو لاشوں کو لے کر کوتوالی آیا اور لاشوں کو ایک رات دن سرِ بازار لٹکائے رکھا۔" [1]

شہزادوں کو قتل کرنے کے بعد ہڈسن نے ان کے سر کاٹے اور انہیں ظفر کے دربار میں لے گیا۔ ظلم و ستم کے اس نظارے کو بہادر شاہ ظفر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ وہ درد تھا جو عمر کے آخری ایام تک ان کے ساتھ رہا اور بالآخر نوے سال کی عمر میں اس درد کو اپنے سینے میں لئے ہوئے اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔

جہاں تک بہادر شاہ ظفر کی شاعری کا ذکر ہے ان کی شاعری قلبی واردات کا بیان ہے۔ ظفر نے زندگی میں جن مصائب کا سامنا کیا اس کی عکاسی اُنہوں نے اپنی شاعری میں کی مگر اُن کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ بعد از مرگ بھی اُنہیں مایوسی اور نا اُمیدی ہی حاصل ہوئی۔ محمد حسین آزاد نے ان کی شاعری کو ذوق کا عطیہ قرار

دیا۔ حالانکہ یہ بات کسی بھی اعتبار سے لائق اعتنا نہیں معلوم ہوتی ہے۔ یہ بات درست ہے کہ ظفرؔ ذوقؔ کے شاگردِ خاص تھے باوجود اسکے ظفرؔ کی شاعری میں انفرادیت کا رنگ غالب ہے اُن کی شاعری حزن و یاس کی شاعری ہے بہادر ظفرؔ کو زندگی سے جو کچھ ملا اُنہوں نے آپ بیتی کو ہی اپنی شاعری کا محور بنایا یہی وجہ ہے کہ ہم اُن کی شاعری کو داخلی شاعری کے زمرے میں ہی رکھتے ہیں۔ ظفرؔ کا ایک ایک شعر اُن کی زندگی کے مختلف نشیب و فراز کی عکاسی کرتا ہے اِس کے برعکس ذوقؔ کی شاعری جہاں ایک طرف جذباتیت سے معمور ہے وہیں دوسری طرف اُن کے یہاں جوش و خروش کے علاوہ بے باکی کا عالم بھی نظر آتا ہے۔ ظفرؔ کی زندگی کے واقعات اور سانحات ہی اُنکی شاعری کے جواز کے طور پر کافی ہیں۔

بہادر شاہ ظفرؔ کو شعر و شاعری سے گہرا شغف تھا جس کا اندازہ ظفرؔ کے چار دیوانوں کی ضخامت سے لگایا جاسکتا ہے۔ شاعری میں ظفرؔ نے ذوقؔ اور بعض اوقات غالبؔ سے اصلاحِ سخن لی جس کی بنا پر بعض نقادوں نے اُن کے کلام کو مشکوک ٹھہرایا۔ جب کہ اُن کی شاعری کے ایک سرسری مطالعہ سے ہی یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ظفرؔ کی شاعری میں ایک تدریجی ارتقاء موجود ہے۔ ابتدائی کلام میں جہاں اُنہوں نے اپنے اساتذہ ذوقؔ اور غالبؔ کی پیروی کی ہے وہیں بعد کے کلام میں ایک انفرادی شان بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ظفرؔ کی شاعری کا ایک غالب عنصر درد و غم کا بیان ہے جب کہ ذوقؔ اور غالبؔ کے یہاں فکر کے ساتھ موضوعات کا بھی تنوع ملتا ہے۔ ظفرؔ کی کُل شاعری نوحہ سازی ہی ہے ایک ایسی پکار ہے جس میں درد و غم اور رنج و الم کے سوا کچھ نہیں۔ تاریخ کا ایک مطالعہ ہی ظفرؔ کی شاعری کو مشکوکی کے عالم سے روشنی میں لاتا ہے۔ جو اشعار ظفرؔ نے کہے ہیں وہ اُن کی زندگی کے المیہ کردار کو ہی پیش کرتے ہیں۔

یار نہیں، خوار نہیں، ہمدرد ظفر اب کوئی نہیں
کنجِ غم میں آپ ہی کہیے دل کو مرے بہلائے کون

ہو چکے دفن فریاد و گریہ کے، کہ پی جاتے تھے اشک
اب تو چشم تر ظفر کچھ آبرو کھوتی چلی

آنکھوں میں روتے روتے نم بھی نہیں ہے اب تو
تھے موجزن جو پہلے، طوفان وہ کہاں ہیں

اس کے علاوہ وہ اشعار جو ظفر نے رنگون کی قید میں لکھے ہیں اس بات کی شہادت فراہم کرتے ہیں ظفر کا کلام ایک فطری عطیہ تھا نہ کہ ذوق یا غالب کا۔ ملاحظہ ہوں یہ اشعار ؎

عمرِ دراز مانگ کر لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو اِنتظار میں

کہہ دو کہ حسرتوں سے کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دِل داغ دار میں

کتنا تھا بد نصیب ظفر دفن کے لئے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

اِس بحث کو خارج کرتے ہوئے جب ظفر کی شاعری کے حوالے سے بات آتی ہے تو اُن کے اکثر و بیشتر کلام کا حصہ اُن اشعار پر مشتمل ہے جن میں زندگی کی نوحہ گری ہی ملتی ہے۔ ظفر کو زندگی سے جو تڑپ اور زخم ملے وہی اَلم اُن کی شاعری کا خاصہ ہے۔ لیکن وہ رنج و اَلم کے اس افسانے کو مختلف پیرایوں میں پیش کرتے ہیں۔

ظفر کے یہاں تصوف کی بھی ہلکی پھلکی جھلک ملتی ہے۔ بادشاہت تو رفع ہو

چکی تھی اس لیے ظفؔر نے مسائلِ تصوف کو ہی وقت گذاری کے لیے مقرر کر رکھا تھا۔ تصوف کو نہ صرف اُنہوں نے اپنی زندگی میں برتا بلکہ اسے شاعری میں بھی پرویا۔ ظفؔر کی شاعری میں زندگی اور دنیا کی تلخ حقائق کا اظہار بھی ملتا ہے اور کفر و ایماں، اخلاق، حق شناسی جیسے عناصر کی کارفرمائی بھی دیکھنے کو ملتی ہے ۔

دل انسان کے آئینہ میں دیکھ اس کو ظفؔر
کہ نظیر اس کا نہیں اس کی مثال اور نہیں

☆

دیر و کعبہ میں ڈھونڈتا کیا ہے
دیکھ دل میں کہ بس یہیں کچھ ہے

☆

اے ظفؔر چاہیے انسان کو کہے ایسی بات
کہ بُرا بھی نہ کہے کوئی گر اُچھا نہ کہے

☆

باغ عالم میں مناسب ہے بشر کو احتیاط
اے ظفؔر چلتی ہو یاں دم بہ دم ہے مختلف

☆

خوبیٔ جوہر سے ہے انسان کی قدر و منزلت
اور اس میں خوبیٔ جوہر نہیں کچھ نہیں
واقعی جینا اسی کا ہے بھلا دنیا میں
اے ظفؔر کرتے ہیں جو کام بھلائی کا

شاعری کا ایک اہم پہلو تاثر ہوتا ہے۔ شعر میں جب تک نہ تاثر پیدا ہو تب تک دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرنا اور اپنی معنویت قائم کرنا شاعر کے لیے محال ہے۔ ظفؔر کا کلام ہر جگہ اپنا تاثر اُبھارتا ہے۔ اُن کے کلام کا ہر ایک لفظ تاثر کی لے میں ڈھوبا ہوا ہے اسی وجہ سے ظفؔر کی شاعری اُن کی نہ ہو کر عوام الناس کی ہو کر رہ گئی ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ کہ وہ منظر کو صفائی اور تاثر کی ہم آہنگی کے ساتھ منکشف کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیے ؎

بات کرنی ہمیں مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تیری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی
لے گیا چھین کے کون آج تیرا صبر و قرار
بے قراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی

ظفؔر نے اپنی شاعری کی معنویت میں اضافے کے لیے اپنی انفرادی طرز سے ہٹ کر بھی شاعری کی۔ اگرچہ اُن کے کلام کا بیشتر حصہ مایوسی، نا اُمیدی اور شدتِ غم کا مظہر ہے باوجود اس کے اُن کے یہاں رند و رقیب، ہجر و وصال، مے و معشوق جیسی روایتی شاعری کی جھلکیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں اور بعض اوقات شوخی و ظرافت کی ہلکی سی دھند بھی۔ یہ تمام باتیں اُن کے کلام میں شاید اس لیے نمایاں ہیں کہ اساتذۂ ظفؔر کے یہاں بھی نقطہ ہائے نظر کبھی ایک نہیں رہا اور تکثیریت کا غلبہ ہمیشہ اُن پر قائم رہا۔ جہاں یہ شعر فکر و آگہی کی باتیں کرتے ہیں وہیں تصوف، فلسفہ، عشق و محبت جیسے موضوعات بھی اُن کی شاعری سے خارج نہیں ہوتے۔ اِسی طرح ظفؔر بھی اپنے اساتذہ کی طرز پر کثیر الجہت شاعری کا ہی انتخاب کرتے ہیں۔ عشق و محبت، رند و رقیب اور مے و ساغر پر اُن کے لکھے گئے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

سناتے ہیں ساقی کو مے خوار ڈھب کی
کہ ہو جائے کوئی مزید ار ڈھب کی
مزا ہے اسی میں کہ ہوں اُن سے باتیں
جو دو چار بے ڈھب تو دو چار ڈھب کی

☆

یہ کیا ستم ہے ہم کہیں رو رو کے اپنا حال
منہ اپنا پھیر پھیر کے وہ بے وفا ہنسے

ظفر کی انفرادیت اس بات میں بھی مضمر ہے کہ اُنہوں نے جہاں غم و اُلم کی شاعری کی وہیں مستی اور نغمگی سے شرابور گیت، بجھن اور ٹھمریاں بھی کہیں۔ اُن کے کلام میں کئی ایسے گیت، بھجن پڑھنے کو ملتے ہیں جو خصوصی موقعوں اور تہواروں سے متعلق ہیں۔ ہولی پر کہے گیے اُن کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے ۔

کیوں موں پر رنگ کی مارو پچکاری
دیکھو کنور جی دوں گی میں گاری
بھاگ سکوں میں کیسے موسوں بھاگا نہیں جات
ٹھاری اب دیکھوں او کوں سنکھ آت
سب کو نکھ سے دیت ہے گاری بھری سبھا میں آج
جب میں آپ نہ لج چلوں تو کس کی تو ہے لاج

ظفر کی شاعری کا اہم حصہ وہ ہے جو ہندوستانی تہذیب اور وطن پرستی پر مشتمل ہے۔ ظفر پر ہندوستانی تہذیب کے کافی گہرے اثرات تھے جس کا اندازہ ظفر کے اُن اشعار سے ہوتا ہے جو اُنہوں نے گیت، بجھن، ٹھمریوں کی صورت میں کہے

ہیں۔ ظفؔر نے اُن اشعار میں ہندوستانی تہذیب اور قدیم روایتوں کا کافی احترام کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ یوں تو اُردو کے تقریباً ہر شاعر نے ہندوستانی تہذیب کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے لیکن ظفؔر کا انداز ان سب سے جداگانہ ہے ملاحظہ ہوں یہ اشعار۔

سکل بن پھول رہی سرسوں
اموا مورے ٹیسو پھولے
کوئل بولے ڈار ڈار اور
گوری کرت سنگھار
مالنیا گڈوا لے آئیں کرسوں
سکل بن پھول رہی سرسوں

جہاں تک ظفؔر کی شاعری میں وطنیت اور قوم پرستی کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں ہم پہلے ہی بات کر چکے ہیں کہ ظفؔر کی تخت نشینی اُس ماحول میں ہوئی تھی جب ملک میں ہلاکت اور جبر و استحصال کا عالم تھا۔ ظفؔر کا ان حالات سے متاثر ہونا ایک فطری بات تھی۔ دوسری جانب سے اگر دیکھا جائے تو وطنیت کا جذبہ کئی پیڑیوں سے ان کے خون میں رچا بسا تھا لیکن ظفؔر کے اندر یہ جذبہ کچھ ایسا تھا کہ اسی (۸۰) سالہ عمر میں بھی وہ جنگ آزادی کے مجاہدین میں شریک ہوئے اور اپنے وطن کو زندہ و تابندہ دیکھنے کی خواہش میں نہ صرف اپنی جان گنوائی بلکہ خاندان کے چشم و چراغوں کی بھی پرواہ نہ کی۔ وطن پرستی کی ایسی بے نظیر مثال تاریخ میں کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔ ظفؔر جہاں عملی طور پر جنگ آزادی میں شریک ہوئے وہیں ان جذبات کا اظہار اُنہوں نے شاعری میں بھی کیا۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار۔

ٹھوکریں کھاؤں پر وطن میں رہوں
کانٹے چنتا ہوا وطن میں رہوں
کانٹے تیری ایک مشت خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

مجموعی طور پر اگر بات کی جائے تو ظفرؔ ایک ایسے تاجدار شاعر گذرے ہیں جنہوں نے نہ صرف وطن کی خاطر اپنا سب کچھ کھویا بلکہ اپنے احساسات، جذبات، قلبی واردات اور زندگی کے گوں ناگوں تجربات سے زبانِ ہندوستانی کو بھی سیراب کیا۔

.....☆☆☆.....

"شیرازہ" میں کشمیری، ڈوگری، پنجابی، لداخی اور بلتی کی منظومات شائع ہوتی ہیں بشرطیکہ اُن کے ساتھ اُردو ترجمہ بھی شامل ہو۔ (ایڈیٹر)

.....

انگریزی: ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام
ترجمہ: تنہا نظامی

مری ماں! مری مُحسن!

لہریں ساگر کی، سنہری ریت، زیارت گاہ
درشکوں کا اعتقاد
رامیشورم مندر اور مسجد کی گلی
اک دوجے میں مدغم ہو کر سب کا ایک ہو جانا
ممتا والی باہیں کھولے جنت کی
میری جانب آتی ہو تم
میری ماں
جیون جنگ کے وہ دن یاد ہیں مجھ کو اماں!
زندہ رہنا ایک سوال بنا تھا جب
اور جو کھم کا کام ہوا تھا جینا اپنا
سورج چڑھنے سے پہلے وہ میلوں چل کر
مندر کے ہمسایہ گُرو سے ازبر میرا سبق کرانا
اور پھر میلوں چل کر عربی پڑھنے اپنا مکتب جانا
وہ اسٹیشن روڈ تلک جانے کی دُھن میں
ریت کے ٹیلے چڑھنا اُترنا
اور اخبار
مندر والے شہر کے لوگوں تک پہنچانا
سورج طلوع ہونے کے چند ہی گھنٹوں بعد
اسکول جانا لوٹ کے آنا
شام کو پڑھنے سے پہلے وہ

گھر کے دُھندوں میں جُٹ جانا
اِک کم سن بیٹے کا سارا درد یہ مُمّا تو جانے ہے
میری جان کے لاغر پن کو
تم نے ایک نئی طاقت میں بدل دیا
اپنے آپ کو فضل و کرم کی طلب میں تیرا
پنجگانہ وہ رُکوع سجود
یقیں تمہارے نے تیرے بچوں کو عزم و طاقت دیا میری ماں
محبتوں سے جو تم نے بانٹی
وہ بے بہا تھی تمہاری پونجی
اُنہی میں بانٹا جو سب سے زیادہ تھے ہاتھ خالی
ترے سوالی
سدا دیا ہے دیا جو تم نے
سب اپنے رب پہ بھروسہ کر کے
مجھے ابھی بھی ہے یاد وہ دن
کہ جب میں دس سال عمر کا تھا
وہ چودھویں چاندنی کی شب تھی
تمام دن کی تکان میں چُور
میں گود میں تیری سو گیا تھا
وہ میرے بھائی تمہارے بیٹے
خفا ہوئے تھے وہ مجھ سے تجھ سے
اور میرے دل کا وہ کیا تھا عالم
تو جانتی تھی تمہیں خبر تھی
میں جاگ اُٹھا تھا نیم شب کو مجھے آغوش میں واپس بُلا لو ماں! مری محسن!

زاہد مختار

مختصر نظمیں

تنکے کی تقدیر

شہر بے حس کے سارے مکین آج
کیوں شام ڈھلتے ہی پھر سے سرکنے
لگے۔ ذرہ ذرہ سمیٹے ہوئے وہ بدن
جب بھی گذرینگے گاؤں کے چوپال
سے وہ جو عریاں ہے بے عار بوڑھا
شجر وہ تو صدیوں سے انصاف کے
نام پر اندھی بہری لکیروں کے اک
جال میں قید کرتا ہے انساں کی تقدیر کو
آج بھی وہ اُسی دنیا میں گم میٹھے لمحوں
کو مٹھی میں جکڑے ہوئے اپنے
سائے کے دامن پہ لکھ جائے گا ایک
تنکے سے تنکے کی تقدیر کو!

☆★☆

ایک شہر اک افسانہ

دُور فلک کی اونچائی پر
اُڑتے ہوئے اِک پنچھی نے
نیچے پھیلی اِس دُھرتی پر
نگہ دوڑا کر یہ سوچا
کہتے ہیں اِس دُھرتی پر تو
سب کچھ ملیا میٹ ہوا
چاول، روٹی، خونی کپڑے
کولا، مٹی اور سامان
بچّے، بوڑھے، پردہ نشیں کی
ہڈیاں ہڈیاں سب یکسان
میری کوئی تیز نظر بھی
کیسے چُن لے اِک دانہ
اب یہ شہر بھی افسانہ!

☆★☆

زاہد مختار

کاغذی دامن

ایک مدت سے میرے قلم کی یہ نب
اپنے لفظوں کے جلتے ہوئے
خواب سے
تیرے دامن کے سائے کو یہ جان کر
اپنی آتش سے کچھ دور رکھتی رہی
کاغذی تیرا دامن ہے
جل جائے گا۔

☆★☆

حکم موت

آو
ظلمت کے سیاہ پنجوں میں
جکڑی لاش کا
دیکھیں یہ منظر
لاش
جس کو
زندہ لاشوں نے دیا ہے
حکمِ موت۔

☆★☆

کے۔ڈی۔ مینی☆

تاریخی مُغل روڑ۔ایک جائزہ

مغل روڑ کو پرانے زمانہ میں نمک روڑ کے نام سے جانا جاتا تھا کیوں کہ وادی کشمیر میں پنجاب سے نمک کی سپلائی اِسی راستے ہوا کرتی تھی۔کشمیر میں مقامی سلطانوں کی حکومت کے دوران یہ راستہ کشمیر پر حملہ کی غرض سے بھی استعمال میں لایا جاتا تھا اور کشمیری حکمران بھی اس راستے سے باہر کے علاقوں پر یلغاریں کیا کرتے تھے لیکن مغلوں کے کشمیر فتح کرنے سے پہلے اس راستے پر زیادہ آمدرفت نہ تھی اور یہ سڑک کشمیر جانے والی دوسری شاہراہوں کی طرح ایک عام پہاڑی راستہ ہُوا کرتی تھی۔

۱۵۸۶ء میں جب شہنشاہ اکبر نے اس راستے میں کشمیر کو فتح کیا تو لاہور تک نزدیک ترین راستہ ہونے کے باعث اس راستے کو کلیدی حیثیت اور زبردست اہمیت حاصل ہو گئی۔فطرت کے دلدادہ مغل شہنشاہوں کو کشمیر کا قدرتی حُسن، فطرت کی گُلکاریاں اور سبزہ زار اور یہاں کے رنگ رنگے موسم بار بار کھینچ کر اِس طرف لانے لگے۔شہنشاہ جہانگیر ۱۶۰۶۔۱۶۲۹ء کے درمیان مرتبہ اس راستے کشمیر کی سیر کو گئے تھے اِسی دوران کشمیر کے ساتھ ساتھ یہ شاہراہ بھی اہمیت کی حامل ہوگئی۔مغلوں نے شاہراہِ نمک کا نام تبدیل کر کے شاہراہِ مغل رکھ دیا اور اس شاہراہ کو مستقل طور پر رابطے کے لئے اپنا لیا۔اِس طرح مغل روڑ کی نہ صرف اَزسر نو تعمیر شروع ہوئی بلکہ لاہور سے سری نگر تک اس پورے راستے پر گاؤں، قصبے، سرائیں، آرام گاہیں قلعے، بارہ دریاں، مسجدیں، حمام، باولیاں بھی سُرخی چونے اور

☆ پونچھ سبٹی، پونچھ (جے اینڈ کے)

اینٹوں کے استعمال سے بنائی گئیں جن کے کھنڈرات اور آثار آج بھی اس سڑک کے آس پاس ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔ اس طرح مغل روڑ کا ویران سنسان پہاڑی راستہ دیکھتے ہی دیکھتے شاہی شاہراہ میں تبدیل ہو گیا جس پر ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، کہار، ہرکارے، اہل کار، اُمراؤ وزرا، درباریوں اور شہنشاہوں کے قافلوں اور کاروانوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔

عہدِ قدیم میں مغل روڑ لاہور سے شروع ہو کر سرینگر تک جاتی تھی اور اِس کی کُل لمبائی ۲۴۶ میل ہوا کرتی تھی لیکن لاہور سے گجرات تک کا ۷۰ میل میدانی سفر اِس میں شمار نہیں کیا جاتا تھا۔ مغل روڑ گجرات شہر سے سرینگر تک ہی مانا جاتا تھا جس کی کل لمبائی ۱۷۶ میل تھی۔ یہ سفر ۱۴ پڑاؤں پر مشتمل ہوا کرتا تھا یہ پڑاو تھے گجرات، بھمبر، سید آباد، نوشہرہ، چنکس، راجوری، تھنہ منڈی، بہرام گلہ، علی آباد سرائے، ہرپور جسے آج کل ہیرپور کہتے ہیں، راموکاک پورہ اور سرینگر۔ ہر پڑاو کا درمیانی فاصلہ دس سے پندرہ میل کے درمیان ہوتا تھا۔ یہ فاصلہ علاقے کے جغرافیائی حالات اور راستے کی نوعیت کو مدنظر رکھتے ہوئے متعین کیا جاتا تھا۔ ایک پڑاو سے دوسرے پڑاو کی مسافت ایک دِن میں طے ہوا کرتی تھی۔ ہر پڑاو پر مغل قافلوں کی سہولیت کے لئے سرائیں، بارہ دریاں، مغل حمام اور مسجدیں بنائی گئی تھیں جہاں شہنشاہ اور دیگر اُمراو وزراء قیام کیا کرتے تھے یہ سلسلہ ۱۵۸۶ء سے لیکر ۱۷۵۳ء تک چلتا رہا اور مغل روڑ پر شاہی قافلے اور کاروانِ رواں دواں رہے۔

لیکن ۱۷۵۳ء میں کشمیر افغانوں کے ہاتھوں پڑ گیا اور کشمیر کا رخ لاہور کے بجائے کابل کی طرف مُڑ گیا۔ اب شاہی کارواں کابل سے چلکر مظفر آباد گڑھی کٹھائی اوڑی اور جہلم ویلی روڑ کے راستے کشمیر آنے جانے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کے مغل روڑ سے توجہ ہٹ گئی اور دھیرے دھیرے اس کی اہمیت جاتی رہی۔ ۱۸۱۹ء کے بعد جب مہاراجہ رنجیت سنگھ والئی لاہور نے افغانوں کو شکست دے کر کشمیر پر قبضہ کر لیا تو ایک بار پھر مغل روڑ پر رونق اور چہل

پہل شروع ہوئی اور ۱۸۱۹ء سے ۱۹۴۷ء کے دوران یہ راستہ نہ صرف سرکاری اہلکاروں کی آمدورفت کے طور پر استعمال ہوتا رہا بلکہ بیرونی ملکوں کے بہت سے سیاح بھی اس راستے کشمیر جاتے رہے ہیں جن میں کتاب کشمیر اینڈ پنجاب کے مصنف جناب بی سی ہیگل اور دی گزٹیر آف کشمیر کے مصنف سی ای بیٹس بھی شامل ہیں۔ ان سیاحوں نے اپنی کتابوں اور سفرناموں میں مغل روڑ کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ لیکن عام طور پر یہ راستہ مقامی پہاڑی اور گجر بکروال لوگ کشمیر آنے جانے کے لئے استعمال میں لاتے رہے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ تقسیمِ ملک کے بعد مغل روڑ کے پہلے پچاس میل یعنی گجرات، بھمبر اور سید آباد سے نوشہرہ کی سرحد تک پاکستان کے قبضے میں چلے گئے تھے اور آزادی کے بعد ایک عرصے تک اس سڑک کی تعمیر کی طرف کسی نے توجہ نہ دی۔

لیکن ۱۹۷۵ء کے بعد جب شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے دوبارہ کشمیر کا اقتدار سنبھالا تو اُنہوں نے مغل روڑ کی تعمیر کا فیصلہ کیا۔ اِس کے دو مقصد تھے اوّل یہ کہ وادی کشمیر کو بیرونِ ملک سے جوڑنے کے لئے متبادل سڑک تعمیر کی جائے اور دوسرا یہ کہ راجوری اور پونچھ جیسے پچھڑے ہوئے اضلاع کو براہِ راست سرینگر سے جوڑ کر یہاں کے عوام کی اقتصادی حالت میں بہتری لائی جائے۔ چنانچہ سروے وغیرہ کا کام مکمل ہونے کے بعد ۱۹۷۸ء میں اس سڑک کی اَزسرِنو تعمیر کا کام شروع کیا گیا اور پہلے تخمینے کے مطابق اس پر لاگت کا نشانہ ۴۵ کروڑ روپے مقرر کیا گیا تھا۔ اور اس سڑک کی تعمیر بڑی برق رفتاری سے شروع ہوئی۔ سڑک کی تعمیر کے لئے ایک ڈویژن شوپیاں کشمیر میں متعین ہوا جس کو شوپیاں سے بھمبر گلی تک ۴۳ کلومیٹر سڑک تعمیر کرنے کے احکامات دیئے گئے جبکہ دوسرا ڈویژن سورن کوٹ ضلع پونچھ میں تعینات کیا گیا جس کو بغلیار سے پیر گلی تک کی ۴۶ کلومیٹر سڑک کی تعمیر کے لئے کہا گیا۔ ان دونوں تعمیراتی ڈویژنوں میں رابطے کے لئے ایک علیحدہ سرکل بھی بنایا گیا اور انجینئر کی تعیناتی

بھی عمل میں لائی گئی۔

۱۹۹۰ء تک آتے آتے ضلع پونچھ کی طرف سے مغل روڑ کے پہلے تیراں کلومیٹر سڑک یعنی بغلیار سے سلان۔ بہرام گلہ چندی مڑھ سے ہوتیہوئے پاناڑ تک تعمیر ہو چکی تھی اور اس کو گاڑیوں کی آمدورفت کے لئے کھول دیا گیا تھا۔ جبکہ پاناڑ سے ڈوگراں اور یشیانہ تک ۲۴ کلومیٹر سڑک پر کام شدومد سے جاری تھا۔ اور ۴۱۲ لاکھ روپے صرف ہو چکے تھے۔ اسی طرح کشمیر وادی کی جانب سے شوپیاں سے ہر پورہ اور دبجن تک ۱۶ کلومیٹر روڑ گاڑیوں کی آمدورفت کے لئے کھول دی گئی تھی۔ جبکہ دبجن سے آگے ساتھریاں اور پھر علی آباد سرائے تک ۱۶ کلومیٹر سڑک پر کام برق رفتاری سے جاری تھا لیکن کچھ وجوہات کی بنا پر ۱۹۹۰ء میں اس سڑک کی تعمیر پر کام روکنا پڑا۔

پچھلے پندراں سالوں میں ریاست جموں وکشمیر نامساعد حالات کا شکار رہی۔ وقت نے کئی رنگ بدلے عوام اور انتظامیہ مسایل اور مصائب میں ایسے مبتلا ہوئے کہ زیادہ تر ترقیاتی کام پس پشت چلے گئے۔

شاہراہ مغل روڑ کی تکمیل سے نہ وادی کشمیر کے لئے متبادل راستہ بن جائے گا بلکہ پچھڑے ہوئے اضلاع پونچھ اور راجوری کا براہ راست کشمیر سے رابطہ بھی قائم ہو جائے گا۔ جس سے ان پسماندہ اضلاع میں رہنے والے عوام کی اقتصادی زندگی میں انقلاب برپا ہونے کی توقع ہے۔ کیونکہ ضلع پونچھ کے علاقہ پیرگلی سے رتن پیر لیاڑی سلسلے کے درمیاں واقع علاقہ پنچ سراں اپنی خوبصورتی کے باعث نہ صرف وادی کشمیر کی سیر گاہوں سے مقابلہ کر سکتا ہے بلکہ یہاں کی چراگاہیں، مرگیں، ڈھوکیں، آبشاریں، دلنواز جنگلی سلسلے، صاف شفاف ندی نالے اور یہاں کے عوام کے روایتی انداز اس کہن مشغلے اور موج میلے ملکی اور بیرونی سیاحوں کی توجو اور کشش کا مرکز بھی بن سکتے ہیں۔ اسی طرح یہاں کے بلند و بالا پہاڑی

سلسلے مہم جوئی اور کوہ پیمائی کے شائقین کے لئے بھی دلچسپی کا باعث بن سکتے ہیں اور لوگوں کے لئے روزگار کے لئے نئے وسیلے بھی میسر آئیں گے جب یہ علاقہ سیاحتی نقشے پر اُبھرے گا۔ ان باتوں کو مدنظرِ رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ شاہراہ مغل روڑ نہ صرف کشمیر کے عوام کے لئے راحت کا سبب بنے گی بلکہ علاقہ پونچھ اور راجوری کے عوام کے لئے بہتر زندگی، سازگار حالات اور روشن مستقبل کی ضامن بھی ہوگی۔

☆☆☆

"شیرازہ" میں چھپنے والی نگارشات

(۱) ہر نگارش کا معاوضہ پیش کیا جاتا ہے بشرطیکہ وہ غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ ہو۔

(۲) ہندوستانی تاریخ و تمدن اور ثقافت و ادب کے مختلف پہلوؤں پر معیاری تحقیقی مضامین قبول کئے جاتے ہیں۔

(۳) ریاست کے تمدنی اور فنی ورثے کے بارے میں تحقیقی اور تنقیدی مقالات ترجیحی طور پر شائع کئے جاتے ہیں۔

(۴) فنِ تعمیر، آرٹ اور مصوری سے متعلق مضامین کے ساتھ آنے والی نادر تصاویر کا الگ سے معاوضہ دیا جا سکتا ہے۔

(۵) منظومات، بشرطیکہ معیاری ہوں، قبول کی جاتی ہیں۔

.....

لحاف کا شاخسانہ

۱۹۴۲ء کے رسالہ ''ساقی'' میں شاہد احمد دہلوی نے عصمت چغتائی کا افسانہ ''لحاف'' شائع کیا جس نے نہ صرف اُن کی زندگی کو ہلا کے رکھ دیا بلکہ پوری اُردو دُنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ اس کے بعد شاہد احمد دہلوی نے اُن کے افسانوں کا مجموعہ ''چوٹیں'' شائع کیا۔ ''لحاف'' کا چھپنا تھا کہ چاروں طرف ایک طوفان برپا ہوا۔ دوست احباب ایک طرف ناراض، خاندان کے افراد دوسری طرف بیزار اور شوہر حد سے زیادہ بدظن۔ عصمت اس واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''جب اخباروں میں خبر نکلی تو میرے سسُر جی کا درد بھرا خط آیا۔ دُلہن کو سمجھاؤ۔ کچھ اللہ رسولؐ کی باتیں لکھیں کہ عاقبت دُرست ہو۔ مقدمہ اور وہ بھی فحاشی پر۔ ہم لوگ بہت پریشان ہیں۔ اللہ رحم کرے۔''[1]

---

[1] آج کل مارچ ۱۹۷۹ء ص ۴

اِتنا ہی نہیں پورے ملک سے عصمت کے نام تضحیک آمیز خطوط آنے لگے۔ اس کا ذکر عصمت خود کرتی ہیں:

''اور پھر مغلظات سے بھرے ہوئے خطوں کا تانتا لگ گیا۔ ایسی انوکھی پیچ دار بھاری بھرکم گالیاں کہ مردہ کے سامنے بک دی جائیں تو اُٹھ کر بھاگ جائے۔ مجھے ہی نہیں، میرے پورے خاندان کو، شاہد لطیف کو، میری دو مہینے کی بچی کو۔ اس کی پیدائش کی خبر کہیں چھپ گئی تھی۔''[1]

اپنے بچپن میں کسی بات سے نہ ڈرنے والی، انتہائی ضدی اور ہٹ دھرم عصمت چغتائی جو اپنے آپ کو کسی مرد سے کم نہیں سمجھتی تھی، اب کچھ سہم سی گئیں۔ اُنھیں محسوس ہو رہا تھا کہ جو خط اُس زمانے میں اُن کے پاس آ رہے تھے، اُن میں سانپ یا بچھو ہوں گے۔ خطوط کو کھولنے سے ڈر لگ رہا تھا اور خط کے دو لفظ پڑھ کر جلا دیتی تھیں۔ اُن کو یہ خطرہ بھی تھا کہ اگر اُن کے شوہر نامدار شاہد لطیف کے ہاتھ کوئی خط پڑ جائے تو طلاق ہو جائے گی۔ حالانکہ شاہد لطیف خود بھی ترقی پسند تھے اور ان منزلوں سے گزر چکے تھے۔

اس افسانے کے چھپنے سے ادبی حلقوں میں ہل چل مچ گئی۔ خواجہ احمد عباس نے اسی افسانے کا انگریزی ترجمہ کیا۔ ترقی پسند خاموش رہے۔ عصمت کا یہ افسانہ اُس زمانے میں شائع ہوا جب اُن کی شادی ہونے والی تھی۔ شاہد لطیف نے اگرچہ اس کہانی کو پسند نہیں کیا تھا لیکن اس کا زیادہ نوٹس

---

[1] آج کل

بھی نہیں لیا۔ اس افسانے کے باعث عصمت چغتائی کی شہرت بھی ہوئی اور اُنھیں زبردست رسوائی کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ حالانکہ عصمت کے مطابق اس افسانے میں کوئی بُرائی نہیں تھی۔ عصمت لکھتی ہیں:

''جب میں نے لحاف لکھا اُس زمانے میں لس بن ازم پر بے باکی سے گفتگو نہیں ہوتی تھی۔ ہم لڑکیاں اس موضوع کے بارے میں آپس میں گفتگو کرتی تھیں اور ہمیں معلوم تھا کہ ایسی کوئی چیز ہے لیکن ہمیں اس کی پوری حقیقت معلوم نہیں تھی۔ میں نے اس کے بارے میں کوئی کتاب یا کوئی ادب نہیں پڑھا تھا۔ اس لیے جب میں نے یہ افسانہ لکھا تو پہلے اپنی بھابی کو دکھایا۔ جو میری ہم عمر تھیں۔ انھوں نے کہانی کے بعض کرداروں کو پہچان لیا اور کہا کہ یہ فلاں فلاں ہے۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ اس میں گندگی ہے۔ اس کے بعد میں نے یہ افسانہ ۱۵ سال کی بھتیجی کو پڑھنے کے لیے دیا۔ وہ میری کہانیاں بہت شوق سے پڑھتی تھی۔ لیکن جب اُس نے یہ کہانی پڑھی اُس نے کہا یہ کیا ہے؟ میں نہیں سمجھتی کہ تم نے کیا لکھا ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں اُسے

سمجھا نہیں سکتی اور وہ بڑی ہو کر اس کو سمجھ سکتی ہے۔''[1]

دراصل عصمت چغتائی کے اندر کا تخلیق کار اُسے بار بار اُکسا رہا تھا۔ وہ سمجھتی تھیں کہ مرد نے ہمیشہ عورت کے ساتھ زیادتی کی ہے اور اپنی بالادستی کے سبب اس کی روح اور اس کے جسم پر قبضہ کر لیا ہے۔ لیکن اس سے قطع نظر جنس کے معاملے میں وہ کبھی کج روئی کا شکار ہو سکتی ہے۔ وہ کوٹھے پر جانے کے لیے مجبور ہو سکتی ہے یا خود جا سکتی ہے۔ اس کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا لگ جاتا ہے مگر مرد اِن منزلوں سے بھی سر اُٹھا کر نکلتا ہے۔ اِسی طرح مرد اپنی جنسی ناآسودگی کے سبب کج رُوی کا شکار ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ اور عورت بھی اس حد تک جا سکتی ہے۔ کمزور لمحات میں کوئی بھی عورت عدم توازن کا شکار ہو کر کچھ بھی کر سکتی ہے۔ عصمت نے ان حقائق پر فن کارانہ انداز میں پردہ اُٹھا دیا ہے اور جنسی کج روی (ہم جنسی) کو ایک بچی کی نظر سے دیکھا ہے۔ لکھتی ہیں:

''جب میں نے اس موضوع پر لکھا، میں نے سوچا میں کتنی بے وقوف ہوں۔ کیونکہ ایسی حرکتیں عورتیں کر سکتی ہیں۔ میں نے سوچا کہ مرد ہمیشہ رنڈی کے کوٹھے پر جاتے ہیں۔ چونکہ لڑکیاں ایسا نہیں کر سکتیں۔ یقیناً میں بعض اوقات بہت ناسمجھ رہتی تھی۔ میں اس معاملے کے بارے

---

[1] سہ ماہی انگریزی محفل ۱۹۷۲ء

میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ کیونکہ اس پر سمجھانے والا
کوئی نہیں تھا۔ لوگ جنس پر تو باتیں کرتے ہیں
لیکن اس بات پر نہیں کرتے جسے کج روی کہتے
ہیں۔ اس لیے جب میں نے یہ افسانہ لکھا تو مجھے
لگا جیسے ایٹم بم پھٹ پڑا ہو۔ لوگوں نے مجھے
بڑے نام دیئے۔ میرا پتہ چونکہ کسی کو معلوم نہیں
تھا۔ اس لیے ایڈیٹروں کے معرفت ملے تھے۔''[1]

چنانچہ ''ادبِ لطیف'' اور ''ساقی'' کی معرفت عصمت کو خط ملنے لگے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہ افسانہ سب سے پہلے ''ادبِ لطیف'' میں ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا اور اس افسانے کے چھپنے کے دو ماہ بعد عصمت کی شادی شاہد لطیف سے ہوئی۔ اُردو کے ادبی حلقوں میں ایک طوفان مچ گیا۔ اور ''لحاف'' کو گندا افسانہ کہا گیا۔ شروع شروع میں مغلظات سے بھرے ہوئے خطوط ایڈیٹر حضرات نے ضائع کر دیے تھے۔ لیکن شادی کے بعد عصمت کو اس تجربے نے بہت ہی زودِ حس بنا دیا اور اس طرح کے موضوع کو انھوں نے کم و بیش ترک ہی کر دیا۔ خود لکھتی ہیں:

''میں اس واقعے کے بعد بے باک الفاظ کا
استعمال ہوشیاری سے کرنے لگی۔ جب کبھی کوئی
شخص ''لحاف'' کا لفظ ادا کرتا ہے تو میں پریشان
ہو جاتی ہوں۔''[2]

[1، 2] سہ ماہی انگریزی محفل

شادی کے بعد عصمت چغتائی کو سرکار کی جانب سے تار ملا۔ شاہد احمد دہلوی پر جس نے ''چوٹیں'' شائع کی تھی، کاتب پر جس نے کتابت کی تھی اور عصمت چغتائی پر جس نے ''چوٹیں'' کا ''لحاف'' لکھا تھا مقدمہ چلایا گیا۔ مقدمے کی سماعت لاہور ہائی کورٹ میں ہونے والی تھی۔ عصمت چغتائی کی شادی ہو چکی تھی اور وہ اُس زمانے میں دہلی میں مقیم تھیں۔ اتفاق سے اُس زمانے میں عصمت چغتائی بنام تاجِ برطانیہ کے مشہور مقدمے کے ساتھ ساتھ سعادت حسن منٹو پر اُن کی کہانی ''بُو'' پر مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔ اور اس کی سماعت بھی اُسی عدالت میں اُسی مقدمے کے ساتھ ساتھ ہونے والی تھی۔ مقدمے کی پہلی پیشی جنوری ۱۹۴۴ء میں ہوئی۔ دوسری پیشی نومبر ۱۹۴۶ء میں ہوئی جب عصمت چغتائی ممبئی میں قیام کرتی تھیں۔ عدالت میں مقدمے کی دل چسپ کاروائی کی روداد سعادت حسن منٹو کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

> ''فحاشی کے الزام میں ایک بار ہم دونوں گرفتار ہوئے تھے۔ مجھے تو دو دفعہ تجربہ ہو چکا تھا لیکن عصمت کا پہلا موقع تھا۔ اس لیے عصمت بھنائی۔ اتفاق ہے گرفتاری غیر قانونی نکلی کیونکہ پنجاب پولیس نے ہمیں بغیر وارنٹ پکڑ لیا تھا۔ عصمت بہت خوش ہوئی لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر منائے مناتی آخر اسے لاہور کے ہائی کورٹ میں حاضر ہونا ہی پڑا۔ ممبئی سے لاہور

تک کافی لمبا سفر ہے لیکن شاہد اور میری بیوی
ساتھ تھے۔ سارا وقت خوب ہنگامہ رہا۔ صفیہ
اور شاہد ایک طرف ہو گئے اور چڑانے کی
خاطر ہم دونوں کی فحش نگاری پر حملہ کرتے
رہے۔ قید کی صعوبتوں کا نقشہ کھینچا۔ جیل کی
زندگی کی جھلکیاں دکھائیں۔ عصمت نے آخر میں
جھلا کر کہا ''سولی پر چڑھا دیں لیکن یہاں انا الحق
ہی نکلے گا۔''[1]

افسانہ ''لحاف'' زندگی بھر عصمت کی کمزور بنا رہا۔ اس بات کے باوصف کہ عصمت بعد کے برسوں میں اس طرح کے موضوعات پر اس شدومد کے ساتھ قلم نہیں اُٹھایا۔ لیکن ''لحاف'' ان کی ادبی شخصیت کا ایک اہم جُزو بنا رہا۔ ترقی پسندوں اور قدامت پسندوں کے اعتراضات کے باوجود عصمت نے اس افسانے کو ردّ نہیں کیا۔ لکھتی ہیں:

''لحاف'' نے مجھے بڑے جوتے کھلائے۔ اس
کہانی پر میری اور شاہد کی اتنی لڑائیاں ہوئیں کہ
زندگی جنگ کا میدان بن گئی۔ مگر مجھے ''لحاف''
کی بہت بڑی قیمت ملی۔ ساری کوفت مٹ
گئی۔''[2]

---

1. گوپال متل - منٹو شخصیت اور فن ص ۲۷۶
2. آج کل ۱۹۷۹ء

''لحاف'' پر جو مقدمہ دائر ہوا وہ اپنی نوعیت کا عجیب مقدمہ تھا۔ پہلی بار ایک جوان مصنفہ پر فحاشی کے الزام میں قدمہ چلایا جا رہا تھا۔ منٹو اور عصمت ساتھ ساتھ عدالت میں پیش ہوئے۔ ادبی حلقوں میں خاصی چہل پہل مچی۔ اُس زمانے میں جب ''لحاف'' کا شور و غل چاروں طرف مچا ہوا تھا تو ''لحاف'' عصمت کی چڑ بن گیا تھا اور برس ہا برس تک یہ لیبل اُن پر چسپاں رہا۔ ایک جگہ لکھتی ہیں:

> ''لحاف'' کا لیبل اب میری ہستی پر چپکا ہوا ہے اور جسے لوگ شہرت کہتے ہیں وہ بدنامی کی صورت میں اس افسانے پر اتنی ملی کہ اُلٹی آنے لگی۔ ''لحاف'' میری چڑ بن گیا۔ میں کچھ بھی لکھوں لحاف کی تہوں میں دُب جاتا تھا۔''[1]

کافی زمانہ گزرنے کے بعد عصمت نے اس موضوع پر پھر لکھنا شروع کیا۔ لیکن ''لحاف'' کی سی بے باکی اور بے رحمی دوسرے افسانوں میں نہیں ملتی ہے۔ ترقی پسندوں نے اِسی افسانے پر کڑی تنقید کی۔ عزیز احمد لکھتے ہیں:

> ''اگر ان کی جنس پرستی میں ذرا روک اور ٹھہراؤ پیدا ہو، ذرا اور توازن ہو اور زندگی کو اصلی جگہ پر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں تو یقین ہے کہ اپنی جدت پسند تحریر، اپنی قوتِ مشاہدہ، اپنی بے

---

[1] آج کل

جھجک حرارت کی وجہ سے وہ در حقیقت اپنے لئے
اُردو ادب میں جگہ پیدا کر سکیں گے۔''[1]

سردار جعفری لکھتے ہیں:

''عصمت چغتائی نے اپنی بغاوت کے لیے
جنسیات کا ہی انتخاب کیا اور کبھی ''گیندا'' کی
طرح اچھی اور کبھی ''لحاف'' کی طرح بُری
کہانیاں لکھیں..... یہ تمام چیزیں ترقی پسند ادب
کے ساتھ اس طرح مل گئیں کہ ہر نیا ادب ترقی
پسند ادب قرار پا گیا اور ہر نئی تحریر ترقی پسند
ادب کا نمونہ بن گئی۔''[2]

لیکن ترقی پسند اور غیر ترقی پسند نقادوں میں ایسے بھی لوگ تھے جنہوں نے عصمت چغتائی کی بے باکی اور بے رحم حقیقت نگاری کو سراہا اور اس کے فن کی تعریف کی۔ ''لحاف'' اور اس قبیل کے افسانوں کا ذکر کرتے ہوئے مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں:

''عصمت نے جس بے باکی اور جرأت کے
ساتھ اُن پردوں کو فاش کرنا شروع کیا ہے ہمارے
ادب میں اُس کی کمی تھی اور اس کی ایک حد تک
ضرورت بھی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ عصمت نے

---

[1] عزیز احمد — ترقی پسند ادب

[2] ایضاً — ایضاً

بے باکی اور عریانی میں مردوں کے بھی کان
کاٹے ہیں۔ مگر مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ
اس انداز کی جنسیاتی بے باکی مردوں کے محکمہ کی
چیز نہیں ہے۔ غور کیجیے تو ماننا پڑے گا کہ ایسی
جرات ایک طناز عورت ہی کر سکتی تھی جو باغی
ہو گئی ہو اور عصمت ترقی پسند ہوں یا نہ ہوں اُن
کو باغی تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔''[1]

عصمت اور منٹو دونوں کی تحریروں میں بیک وقت متضاد رجحانات پائے جاتے تھے لیکن منٹو آہستہ آہستہ ترقی پسند تحریک سے دُور ہوتے گئے اور عصمت اس کے قریب آتی گئیں۔ منٹو جنہوں نے اپنی ابتداء گورکی کے ترجموں اور تقلید سے کی تھی، ڈی۔ ایچ۔ لارنس اور سامرسٹ ماٹم کے دامِ فریب میں مبتلا ہو گئے اور عصمت چغتائی جنہوں نے ابتداء جنس نگاری سے کی تھی، حقیقت نگاری کی منزل کی طرف بڑھ گئیں۔

افسانہ ''لحاف'' جس نے عصمت چغتائی کو بدنام بھی کیا اور انہیں شہرت بھی دلوائی ایک بہتر ردِ عمل کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ عصمت نے اس میں جس خاتون کو موضوع بناتا تھا اُس نے اس افسانے کے بارے میں سُن کر خود کے شوہر کے جور و جفا کی قید سے آزاد کیا اور اپنے شوہر سے طلاق لے کر دوسری شادی کر لی۔ عصمت نے اس واقعہ کے بارے میں لکھا ہے:

---

[1] عبدالغفار نیا ادب

''بہت دن بعد علی گڑھ گئی۔ وہ بیگم جن پر میں نے کہانی لکھی تھی اُن کے خیال سے رونگٹھے کھڑے ہونے لگے۔ لوگوں نے انھیں بتا دیا تھا کہ ''لحاف'' اُن پر لکھی گئی ہے۔ ایک دعوت میں اُن سے سامنا ہو گیا۔ میرے پاؤں تلے زمین کھسک گئی۔ اُنھوں نے بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھول کی طرح کھل اُٹھیں۔ بھیڑ چیرتی ہوئی لپکیں اور مجھے گلے لگا لیا۔ مجھے ایک طرف لے گئیں اور بولیں ''پتہ ہے میں نے طلاق لے کر دوسری شادی کر لی ہے۔ ماشا اللہ چاند سا بیٹا ہے۔'' اور میرا جی چاہا کسی سے لپٹ کر زور زور سے روؤں۔ آنسو روکے نہ رُکے۔ مگر قہقہے لگا رہی تھی۔ اُنہوں نے میری بڑی شاندار دعوت کی۔ میں مالا مال ہو گئی۔ اُن کا پھول سا بچہ دیکھ کر مجھے ایسا لگا وہ میرا بھی کوئی ہے۔ میرے دماغ کا ٹکڑا۔ میرے ذہن کی جیتی جاگتی اولاد۔ میرے قلم کا بچہ۔''[1]

☆☆☆

---

[1] آج کل مارچ

عرش صہبائی

○

اِک کل کی طرح ہم نے ہے چٹکتے رہنا
بیل بن کر کبھی شاخوں سے لٹکتے رہنا

وہ خزاں ہو کہ بہار اِس سے نہیں کوئی غرض
کوئی موسم بھی ہو ہم کو ہے چٹکتے رہنا

اِک ستم گر سے ہے اُمید وفا کی ایسے
جس طرح پتھّروں سے سَر کو پٹکتے رہنا

صرف وہ پھول ہی ماحول کو مہکاتے ہیں
جانتے ہیں جو بہر رنگ چٹکتے رہنا

گہری سوچوں کو جگہ دینا ہے دِل میں ایسے
جیسے احساس کی سُولی پہ لٹکتے رہنا

موجِ طوفاں میں ہم ایسے میں کیا اُمید کریں
اُس نے ساحل سے ہے بس سر کو پٹکتے رہنا

ختم ہوگی کبھی دُنیا سے یہ دہشت گردی
ہم نے اِس حال میں کب تک ہے لٹکتے رہنا

عرشؔ کو ہر گھڑی تم ہنستے ہوئے پاؤ گے
ایک غنچے کی فطرت ہے چٹکتے رہنا

●

عاصم امروہوی

○

منزلِ شوق کا بس اتنا پتا مانگے ہے
چشمِ عاشق ترا نقشِ کفِ پا مانگے ہے

اُس ہوس کار کو عاشق تو نہیں کہہ سکتے
جو محبت میں وفاؤں کا صلہ مانگے ہے

معبدِ دل کا بسانا تو ہے سب کا مقصود
کوئی بُت مانگے ہے اور کوئی خدا مانگے ہے

قرب اور بُعد کا ہے فرق کہ اِس دنیا میں
کوئی چاہے ہے بقا، کوئی فنا مانگے ہے

عشق کا ظرف کہ زہر اَب گوارا ہے اُسے
حُسن کج فہم ہے جو آبِ بقا مانگے ہے

زندگانی کے حسیں خوابوں کی روشن تعبیر
حُسنِ معصوم باندازِ حیا مانگے ہے

خونِ عشاق سے رنگنے کا تصوّر ہوگا
دستِ محبوب جو اَب رنگ حنا مانگے ہے

غنچۂ دل کے کِھلائے کو نسیمِ سحری
اور اَنگڑائی کو وہ شوخ صبا مانگے ہے

مانگنے کی کبھی حاجت نہ رہے گی عاصمؔ
بس اُسے مانگ لے تو جس سے دُعا مانگے ہے

☆

☆☆☆

رفیق رازؔ

دی یہ کس نے اذاں راستے میں
جھک گیا آسماں راستے میں

کس سفر پر روانہ ہوئے ہیں
آگیا لا مکاں راستے میں

اس سفر میں تھا خورشید بھی اک
ذرۂ ضو فشاں راستے میں

پار جوں توں سمندر کیا تھا
اب ہے کوہ گراں راستے میں

سنگ واشجار نے اک الگ ہی
داستاں کی بیاں راستے میں

میرا سایہ ہے میرے علاوہ
اور کیا ہے یہاں راستے میں

خامشی جب ہوئی اور گہری
بن گئی ہم زباں راستے میں

جوئے معنی کہیں خامشی سے
ہو نہ جائے رواں راستے میں

کھول دے ہم فقیروں پہ یارب
سِرِّ کون و مکاں راستے میں

تو ہی تو ہے وہاں منزلوں پر
میں ہی میں ہوں یہاں راستے میں

روشنی کیلئے تھی مقرر
ایک برقِ تپاں راستے میں

بھید ظلمات کے کھولتی ہے
گردِ سیارگاں راستے میں

تیری آواز آئی کہیں سے
مل گئے دو جہاں راستے میں

نصب کس نے کیا تھا سفر میں
ابر کا سائباں راستے میں

ایڑیاں تم رگڑ کے تو دیکھو
چشمہ ہوگا رواں راستے میں

پھر سے منزل کا ہوگا تعین
رُک گیا کارواں راستے میں

ہے ابھی دور کتنی یہ دلی
کیا بتاؤں میاں راستے میں

☆☆☆

بلراج بخشی

☆☆☆

کتنا گھور اَندھیرا ہو راتوں رات سویرا ہو
دنیا تیری ہے لیکن اِس میں کچھ تو میرا ہو
پھر جنگل کے گیت سُنوں پھر جوگی کا پھیرا ہو
رَستہ شہروں شہر چلے جنگل جاڑ بسیرا ہو
حیرت، خوف، خوشی برَسے ناگن، بین، سپیرا ہو
دُھوپ کی بارش ہو لیکن سایہ گھنا گھنیرا ہو
اِک وادی ہو پنہندوں کی اور خوابوں کا ڈیرا ہو
روشنی ہو جاؤ بلراج
جب سیالوں نے گھیرا ہو

●

پرویز مانوسؔ

☆☆☆

جو اَپنے گاؤں کا منظر سہانا بھُول جاتا ہے
نئی بستی میں آ کر وہ ٹھکانا بھُول جاتا ہے

دُعا کے بیج تو بوتا ہے اپنی کشتِ ویراں میں
بے چارہ درد کے آنسو بہانا بھُول جاتا ہے

بُلاتا روز ہے وہ چاند کو دل کی حویلی میں
مگر دہلیز پر پلکیں بچھانا بھُول جاتا ہے

درندے جھانکتے ہیں جب کبھی غُربت کی وادی میں
وہ چھپر میں جواں بیٹی چھپانا بھُول جاتا ہے

کسی کا درد لفظوں میں بیاں کرنے سے پہلے ہی
قلم کاغذ وہ ہاتھوں میں اُٹھانا بھُول جاتا ہے

مچلتا ہے بُریدہ پر کبوتر دیکھ کر بچّہ
مگر خوں دیکھ کر ٹہنی ہلانا بھُول جاتا ہے

نئی رُت میں بناتا ہے وہ کانٹوں سے نیا رشتہ
جو کھایا زخم پھولوں سے پُرانا بھُول جاتا ہے

☆☆☆

پرویز مانوسؔ

☆☆☆

ذرا سا آسماں پر ہے وہ بادل دیکھتے رہنا
بنا دے گا ہرے کھیتوں کو دَلدل دیکھتے رہنا

صدائیں وحشیوں کی آ رہی ہیں روح سے میری
مِرے اندر بھی اُگ آئے گا جنگل دیکھتے رہنا

کھڑا ہو کر کے پنجوں پر تمنا چاند چھونے کی
بنا دے گی تجھے اک روز پاگل دیکھتے رہنا

نہیں معلوم تجھ کو کس قدر چوری میں ہے ماہر
چُرا لے گا تیری آنکھوں سے کاجل دیکھتے رہنا

تِرا کنکر کرے گا آشنائے درد پانی کو
مچے گی جھیل کے سینے میں ہلچل دیکھتے رہنا

کرو اظہارِ غم غیروں کے آگے شوق سے لیکن
چھلکنے پائے نہ آنکھوں کی چھاگل دیکھتے رہنا

نہیں مانوسؔ اتنی خوب حق گوئی بھی باز آؤ
دکھائے گی صداقت راہِ مقتل دیکھتے رہنا

☆☆☆

پرویز مانوسؔ

☆☆☆

مچاتے شور ہیں باہر کبھی اندر پرندے
بھٹکتے پھر رہے ہیں شہر میں دَر دَر پرندے

ہرے جنگل کی وادی میں عجب سی چاپ سُن کر
لگے سب پھڑ پھڑانے فکر میں ڈر کر پرندے

جو آندھی نے کیا برباد اِن کو سازشوں سے
لُٹا کر آشیاں جائے گے کِس کے گھر پرندے

وہ کوّا چھین کر روٹی کا ٹکڑا لے گیا جب
تو بچی کہہ اُٹھی بے ساختہ جا مر پرندے

یہ بستی خُونچکاں ہونے لگی گر روز یُونہی
ہنسیں گے بیٹھ کر آدم کی لاشوں پر پرندے

مہک جائیں گی میرے ذہن کی سب وادیاں جب
گُزر جائیں گے میرے جسم کو چھُو کر پرندے

کبھی مانوسؔ جو کھڑکی پہ تنہا بیٹھ جائیں
تو لے آتے ہیں اُن کی یاد کا لشکر پرندے

☆☆☆

رئیس الدّین رئیس

☆

خلوص جب سے نظر میں فضول ہو گیا ہے
ہر ایک لمحہ ہستی ملول ہو گیا ہے

ہمیں جو لُطفِ سفر کا حصول ہو گیا ہے
ہمارا نقلِ مکانی اُصول ہو گیا ہے

تمہارے قُرب کے رستے سے جس کو آنا تھا
اُس ایک شعر کا مُجھ پر نزول ہو گیا ہے

تمہارے ہاتھوں میں شمشیرِ بے بنام بھی ہے
ہمیں بھی سر کو کٹانا قبول ہو گیا ہے

ہمارا ذوقِ مسافت بھی لفظِ بے معنی
ہمارا نقشِ کفِ پا بھی وصول ہو گیا ہے

جو خام راہ پہچان اپنی کھو آیا
وہ اختصارِ سفر مجھ کو طول ہو گیا ہے

مرے جگر کی سپر بھی فڈھال ہوگئی ہے
تری نگاہ کا شعلہ بھی پھول ہو گیا ہے

رئیس تمغہ مِلا کیا ہے گُل بیانی کا
کہ حرف حرف ہمیں کو ببول ہو گیا ہے

☆ ۱۷۲۵/۱۰ دھلی گیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

☆

رئیس الدّین رئیس

مُجھ سے کب تَرکِ اَنا ممکن ہوا
میرے قبضے میں کہاں یہ جِن ہوا

منکشف دریا کا جب باطن ہوا
ساحلوں پر آسماں ساکن ہوا

شہر میں رقصاں ہوئی ہے بے چارگی
دَرد کی دولت کا میں خازن ہوا

آسماں نے کر دیا تبدیل سب
دشمن جاں ہی مرا مُحسن ہوا

نیند میں جلتا رہا اک مرغزار
ایک دشتِ بیکراں سا دِن ہوا

تمہیں ساری مجھے منظور ہیں
تجھ سے کب پاسِ وفا ممکن ہوا

میری جان و حال کا طالب رئیسؔ
کیوں عدالت میں مراضامن ہوا

☆

کشمیری لال ذاکر*

یاترا سے لوٹی پوتر لڑکی

اَمرناتھ کی یاترا سے لوٹی ایک نہایت ہی خوبصورت لڑکی نے مجھ سے پوچھا، جب میں چندن واڑی کے ایک موڑ پر کھڑا یاترا سے واپس آئے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔

'تم شیش ناگ سے ہی لوٹ آئے تھے؟'

'ہاں'

'کیوں؟'

'اس لئے کہ وہاں کی جھیل امرناتھ کی گھپا سے زیادہ خوبصورت تھی۔'

'تم جھوٹ بولتے ہو۔' اس سحر بھری آنکھوں والی لڑکی نے کہا، جو دیکھنے میں دیوی سماں پوتر لگ رہی تھی۔

'میں دراصل جھوٹ ہی بول رہا ہوں'۔

'سچ کیوں نہیں بولتے؟'

'سچ بولنے والوں کا حشر بہت بُرا ہوتا ہے۔'

---

*.....پنچکولہ۔ ہریانہ

'تم کن لوگوں کی بات کر رہے ہو؟'

'کرائسٹ کی، بدھ کی، نانک کی، گاندھی کی؟'

'اور کیا کیا تھا انہوں نے؟'

'وہ تو صرف سچ کی تلاش کرتے رہے تھے۔'

'اگر سچ کی تلاش کرنے والوں کا یہ حشر ہو سکتا ہے تو سچ بولنے والوں کا کیا حشر ہوگا؟'

'وہ موکش پراپت کر لیتے ہیں۔'

'یہ موکش کیا چیز ہے؟'

امرناتھ کی یاترا سے لوٹی پوتر لڑکی میرے اس سوال پر زور سے ہنسی اور اس کی ہنسی سے ہمیں چاروں طرف سے گھیرے، بلند و بالا پہاڑوں کی ننگی چوٹیاں گونج اٹھیں۔

'تم جیسے پاپی جیو یہ راز نہیں جان سکتے۔'

'تو پھر کون جان سکتا ہے؟'

'امرناتھ کی گپھا کے سامنے چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر کھڑے سادھو، جو اسکی تلوار کی طرح تیکھی چوٹی پر کھڑے ہو کر گپھا میں برف سے اٹی گہرائی میں کود جاتے تھے اور امر گنگا کے برفیلے پانی میں ان کی لاشیں ڈوب جاتی تھیں۔'

'یہ راز تو پھر وہ سادھو اپنے ساتھ ہی لے جاتے تھے۔ کھلتا کہاں تھا یہ راز کسی پر؟'

میری یہ بات سن کر یاترا سے لوٹی پوتر لڑکی گھبرا گئی۔ جب اسے کوئی جواب نہیں سوجھا تو بولی۔

'تم تو کٹر ناستک ہو۔'

سورج اونچے اونچے پہاڑوں کی اوٹ میں جا چکا تھا۔ ہم جس تنگ سی وادی میں

کھڑے تھے، اب اس میں ان پہاڑوں کے غیر مربوط سائے رینگنے لگے تھے۔ یاتریوں کی تعداد بہت کم ہوگئی تھی۔ اِکا دکا یاتری رہ گیا تھا۔ مٹی سے اَٹے خچر کے ساتھ چلتا ہوا اَب پہلگام کا خواب لے رہا تھا۔ جہاں پہنچ کر وہ یاتری سے اپنی رقم وصول کرے گا اور اُپنے خچر کو لدرنالے کے اوپر والے حصے میں چرنے کو چھوڑ دے گا اور خود نمکین چائے کے ساتھ نمکین قلچے کھاتے ہوئے سفر کی تھکان بھولنے کی کوشش کرے گا۔

تھوڑی دیر میں اِکا دکا یاتری بھی سو جائیں گے اور اونچے اونچے پہاڑوں کے سائے اور گہرے ہوتے جائیں گے۔ اس وقت یاترا سے لوٹی یہ خوبصورت پوتر لڑکی کیا کرے گی؟ اس کے بدن پر تو صرف ایک پل اور تھا اور ہاتھ میں ایک لاٹھی تھی اور چہرے پر معصومیت کے ساتھ ساتھ گورے رنگ کی چکنائی تھی..... جس کے بَیس پر راستے کی تمام دھول جمی تھی۔ یہ پُل اور، یہ لاٹھی، گورے رنگ کی چکنائی اور پگڈنڈی کی گہری دھول یہ سب تو اِسے نہیں بچا پائیں گے، ان سرد اور تیز جھونکوں سے جو تھوڑی ہی دیر میں نیند سے جاگ جائیں گے اور اس چھوٹی سی محدود وادی میں حشر برپا کر دیں گے۔

• 'تو تم کیا جواب چاہتے ہو؟'

اس نے پوچھا

'جو آج سائنس کے دَور میں جیتے ہوئے انسان کو مطمئن کر سکے۔'

آج کے سائنسی دَور کا انسان کبھی مطمئن نہیں ہوگا..... کیونکہ اس کا فیتھ (Faith) ٹوٹ چکا ہے۔'

'کس نے توڑا ہے اس کا فیتھ؟'

'اس کی اپنی سوچ نے۔'

'تو سوچ کا پروسیس ختم کرنا چاہتی ہو تم؟'

'نہیں صرف فیتھ کو مضبوط کرنا چاہتی ہوں۔'

'کیسے؟'

امرناتھ کی گپھا تک جا کر شیش ناگ کی جھیل سے ہی واپس آ کر نہیں۔' میں یاترا سے لوٹی اِس پوتر لڑکی بات سن کر مسکرایا۔

'تم تو گھپا سے ہی لوٹی ہو نا؟'

'ہاں۔'

'کیا دیکھا تم نے وہاں؟'

'یہ پوچھو کہ کیا نہیں دیکھا۔'

'یہ نہیں پوچھوں گا؟'

'اور کیا پوچھو گے؟'

'یہی کہ تم نے گپھا میں کیا دیکھا تھا؟'

ہزاروں کی تعداد میں یاتری جو شِیولنگ کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے صبح سے ٹھنڈ میں کانپ رہے تھے۔'

'اور.....؟'

'کبوتروں کے جوڑے کی ایک ہلکی سی جھلک، جو صبح سویرے ایک بار گپھا سے نکل کر شام کو ہی لوٹتا ہے۔'

'سب کو آتا ہے نظر کبوتروں کا وہ جوڑا؟'

'نہیں.....'

'تو سب لوگ بیوقوفوں کی طرح کیوں ان کے انتظار میں کھڑے رہتے ہیں؟'

'فیتھ، میرے ناستک دوست صرف، فیتھ؟'

'تم نے دیکھا تھا کبوتروں کا وہ جوڑا؟'

'میرے وہاں پہنچتے ہی وہ گپھا سے باہر اڑان بھر رہا تھا۔ میں نے صرف ایک پرچھائی دیکھی تھی ان پوتر پنچھیوں کی۔' اس پوتر لڑکی کی بات سن کر میں ہنسا۔ اتنی زور سے کہ ہمارے اردگرد پھیلتے ہوئے گہرے گہرے سائے بھی لرز اٹھے۔ جو اِکا دُکا یاتری واپس جا رہے تھے ان کی تعداد بھی اب بہت کم ہو گئی تھی۔ شاید سب اپنی اپنی منزل پر پہنچ چکے تھے۔ میری ہنسی شاید خاموش وادی میں زیادہ بلند ہو گئی تھی۔ وہ لڑکی بولی۔

'تم اتنی زور سے کیوں ہنس رہے ہو؟'

'جب بھی میرا کوئی مخالف ہارتا ہے تو میں زور سے ہنستا ہوں۔'

'تم سمجھتے ہو کہ میں ہار گئی ہوں۔'

'نہیں..... ہار رہی ہو۔'

'میں ہاروں گی نہیں۔'

'ہر ہارنے والا یہی کہتا ہے۔'

'تم کیا کہتے ہو.....؟'

'میں کہتا ہوں کہ یہ راستے اب سنسان ہو رہے ہیں۔ ہوا کے جھونکے اور سرد ہوتے جا رہے ہیں۔ سب یاتری اب اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ گئے ہیں۔ ہمیں بھی اب لوٹ جانا چاہئے۔

'کہاں؟'

'جہاں تم چاہو۔'

'میں کہیں جانا نہیں چاہتی۔'

'تو تم یہیں رہو میں چلتا ہوں۔'

'کیوں.....؟'

'میرے پاس ان سرد ہوا کے جھونکوں سے بچنے کیلئے نہ کوئی گرم کپڑا ہے اور نہ وہ فیتھ ہے جو لوگوں کو زندگی کش حالات میں بھی زندہ رکھ سکتا ہے۔'

'تو تم میرا فیتھ لے لو۔'

'صرف فیتھ سے کام نہیں چلے گا۔'

'تو میرا پُل اوور بھی لے لو۔' یہ کہہ کر اس لڑکی نے اپنا پل اوور اتار کر مجھے دے دیا اور خود وہ سرد ہوا کے جھونکوں میں ٹھٹھرنے لگی۔

'تم کیا کرو گی؟'

'میں کسی خیمے میں رات گزار لوں گی، جہاں سے سب لوگ جا چکے ہوں گے۔'

'مگر کیوں؟'

'اس لئے کہ میں موکش پراپت کرنا چاہتی ہوں۔'

اب اندھیرا ہونے لگا تھا۔ مجھے یاترا سے لوٹی اس پوتر لڑکی کے خدوخال بھی اَب دُھندلے نظر آنے لگے تھے۔ ہوا بہت تیز تھی۔ دیوار کے درختوں سے اب ایسی آوازیں آنے لگی تھیں، جو دن میں بہت دلکش لگتی تھیں لیکن جنہیں اب سننے سے خوف آتا تھا۔

'کیا موکش صرف ٹھنڈی یخ آلود ہواؤں میں اکڑ کر مر جانے سے ہی پراپت ہوتا ہے؟'

'مجھے خود معلوم نہیں۔'

اس لڑکی نے ہوا کے سرد جھونکوں سے بچنے کیلئے اپنے آپ کو اپنے بازوؤں

میں سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔

'تو آؤ میرے ساتھ چلو۔'

'کہاں.....؟'

'پہلگام۔ جہاں میرے پاس ایک ہٹ ہے۔'

'اس میں کتنے کمرے ہیں؟'

'تین۔'

'مجھے ایک کمرہ دے سکو گے؟'

'کمرے کے علاوہ ایک بستر بھی۔'

'تو چلو۔'

اور پھر امرناتھ کی یاترا سے لوٹی وہ پوتر لڑکی اور میں پہلگام کی طرف چل پڑے۔ چندن واڑی کے پل کے اُس پار میری کار کھڑی تھی۔ میں نے کار کا دروازہ کھولا اور اپنی سیٹ کے ساتھ لگتا دوسرا دروازہ بھی کھول دیا۔ وہ لڑکی میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی، اس نے دروازہ بند کر دیا، میں نے کار اسٹارٹ کر دی۔

پہلگام پہنچ کر میں نے اپنی کاٹیج کی طرف گھما دی۔ ہوا اور تیز ہو گئی تھی۔ لدر نالے کے پانی کے پتھروں سے ٹکرانے کے کارن بہت اونچی آوازیں فضا میں گھل رہی تھیں۔

نوکر ہٹ کے باہر کھڑا بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔

میں نے اس پوتر لڑکی کو اس کا کمرہ دکھایا، اس کے باتھ روم میں گرم پانی رکھوا دیا۔ اس کا بستر بھی الگ لگوا دیا اور اسکا پل اور اس کے تکیے پر رکھ دیا۔ پھر ہم دونوں نے اکٹھے کھانا کھایا۔ کچھ دیر ٹرانسسٹر سے گانے سنے اور پھر میں نے کہا۔

'اب تم اطمینان سے سو جاؤ کہ اصل موکش گہری نیند میں ہے۔'

'اور تم؟'

'میں واپس شیش ناگ جاؤں گا۔'

'اس وقت؟'

'ہاں۔'

'لیکن کیوں؟'

'کیونکہ میرا موکش اسی میں ہے۔'

موکش کی متلاشی لڑکی مجھے روکتی رہی۔ بلکہ ایک بار اس نے مجھے بازو سے پکڑ لیا اور اپنی طرف گھما بھی دیا۔ لیکن میں رکا نہیں اور جب میں کار اسٹارٹ کر رہا تھا، وہ پوتر لڑکی جسے موکش کی تلاش تھی، میری ہٹ کے برآمدے میں کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ جو میں نے تو خیر بالکل نہیں دیکھے لیکن اس دھندلی سی چاندنی نے ضرور دیکھے تھے جو تمام وادی کو اپنے دامن میں سمیٹے اسے نیند کی لوریاں سنا رہی تھی۔

'شیش ناگ کی جھیل بہت خطرناک ہے۔ مت جاؤ موکش یہاں بھی مل سکتا ہے۔'

یہ اس پوتر لڑکی کی آواز تھی جو اس شام یاترا سے لوٹی تھی اور میرے ساتھ میری ہٹ میں آ گئی تھی اور اب اسے اس ہٹ میں اکیلے رات گزارنے سے خوف آ رہا تھا۔ وہ جسے موکش کی تلاش تھی۔

اس کا فیتھ میرے لڑکھڑاتے ہوئے فیتھ کی رگوں میں سما گیا تھا۔ وہ جو یاترا سے لوٹی ایک بہت ہی خوبصورت پوتر لڑکی تھی۔

●●●

مشتاق مہدی

شکر بابا

پتہ نہیں.....کون تھا وہ کہاں سے آیا تھا.....؟ وہ کچھ عرصے سے اُس شہر میں دکھائی دیا۔ کندھوں پر شکر کی بوری لئے.....اچاٹ سی گلی میں اور کبھی کسی اور سڑک پر موڑ میں ہوتا.....تو میٹھے سروں میں کبھی گا بھی لیتا

لے لو شکر.....میٹھا شکر

مفت یہ شکر.....

شکر بابا ہے آیا تیرے شہر میں.....

لے لو شکر.....میٹھا شکر.....

وہ بلا لحاظ مذہب رنگ لوگوں میں یہ شکر تقسیم کر رہا تھا.....بغیر کسی معاوضے کے .....مگر لوگ.....لوگ اُس سے دور بھاگتے۔ اُسے شک کی نظروں سے دیکھتے تھے.....

سیاست دانوں نے کہا.....

'ہمارے دشمن کا جاسوس ہوگا.....اور کون ہوگا'

دانشوروں نے فتویٰ دیا

'فریبی.....کوئی ڈھونگی ہوگا.....جال پھینکتا ہے

نہ معلوم کیا لوٹ کے جائے گا یہاں سے.....'

فلسفیوں نے اُسے موضوعِ بحث بنایا

'آخر وہ کیوں یہ شکر مفت تقسیم کر رہا ہے.....'

بڑے بزرگوں نے کہا.....

'نہ ایسا سنا ہے۔ نہ ایسا دیکھا ہے کبھی.....کون کسے

کیا مفت دے گا۔ ضرور کوئی جعلساز ہوگا۔'

جواں حسیناؤں نے آپس میں کہا

'شکر وَ کر تو ایک بہانہ ہے۔ وہ ہمیں پُھسلانے کے لئے

دانہ پھینک رہا ہے.....'

اور ماؤں نے اپنے اپنے بچوں کو سمجھا دیا..... بلکہ ڈرا دیا.....

'سنا تم نے.....اُسکے پاس ہرگز نہ جانا.....وہ بوری میں

بھر کے تمہیں لے جائے گا.....؟

'ماں.....کہاں لے جائے گا۔؟'

'وہیں.....وہ کہاں سے آگیا ہے.....'

'ماں.....وہ کہاں سے آگیا ہے.....'

'کیا پتہ.....کہاں سے آگیا ہے.....تم نے یاد رکھا..... ہرگز

بھی اُس کے قریب نہ جانا.....'

بچے.....آخر بچے تھے۔ ڈر سے گئے۔ اور گھروں کے نیم

تاریک کونوں میں چھُپ گئے۔

شکر بابا اپنی ہی دُھن میں مست رہنے والا آدمی تھا۔ لوگوں کی باتوں کی کم ہی پروا

کرتا تھا.....تو بس اپنا کام پورا کر دیا تھا۔ دن بھر شکر کی بوری کندھوں پر اٹھائے کبھی اِس گلی میں نظر آتا.....تو کبھی اُس موڑ پر اور کبھی کسی باغ میدان میں.....شام کو اپنے ٹھکانے پر پہنچکر خدا کا شکر ادا کرتا کہ جس کے مقدر میں جو دانا رکھا تھا۔ اُسے وہ دے آیا ہے۔

وقت اور موسم ایک سا نہیں رہتا ہے

موسم بدل گیا تھا.....اور بدلتے موسم کے ساتھ ہی لوگوں کے سوچنے کے انداز میں بھی تبدیلی سی آ گئی۔

سیاست کاروں یک زباں ہو کر کہا.....

"شکر بابا.....انسانیت کا دوست ہے۔ محبت کا عَلم بردار ہے"

دانشوروں نے اپنی رائے بدل ڈالی تھی.....

'ایک نیک روح.....ایک مہان انسان.....ایک درویش۔'

بزرگوں نے اپنی آواز ملائی.....

'ماضی میں بھی بہت سے اپنے لوگ گذرے ہیں۔ جو نام کما گئے ہیں جو سخی تھے.....سبکو کچھ نہ کچھ دیتے تھے اور کسی سے کچھ نہ لیتے تھے۔'

جوان حسیناؤں اور عورتوں نے ایک ہی زبان میں کہا 'ایک مہربان جوگی.....نہ معلوم کسی جوگن کا خواب۔"

اور بچے.....جو پہلے ڈرتے تھے.....دُور بھاگتے تھے اُس سے.....اب اُس کے قریب ہی ہنستے مسکراتے اپنے لڑکپن کے کھیل.....(کاٹ شاہی بم ﴿ بم شاہی کاٹ) کھیلتے ہوئے نظر آتے.....شکر بابا بھی اُن کے ساتھ گھُل مل جاتا تھا۔

پھر ایک دن ایسا ہوا.....جونہی وہ نیند سے بیدار ہوا۔ اُسکی نگاہیں۔ بوری سے جا ٹکرائیں.....بوری قریب قریب خالی ہو چکی تھی.....وقت بہت آگے جا چکا تھا

.....تو.....تو کیا یہ شہر چھوڑنے کا وقت آ گیا۔ وہ اداس سا ہو گیا..... مزید کچھ سوچے بغیر بستر سے اٹھ گیا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ شکر کی بوری کندھوں پر اُٹھائی اور نکل پڑا شہر کے بڑے چوراہے کی طرف!

جب وہ شکر کا آخری دانہ تقسیم کر چکا۔ تو اسکے چہرے پر مسرت اور اطمینان سا جھلکنے لگا۔ اُسنے دور دور تک نظریں دوڑائیں .....شہر اُسے خوبصورت لگا۔ اپنا سا لگا..... پیارا سا لگا۔ اُس نے کچھ دیر کے لئے آنکھیں بند کیں.....جیسے شہر کا سارا حسن اپنی نگاہوں میں قید کر کے جانا چاہتا.....

اُس نے آنکھیں کھولیں.....اب اُسکی واپسی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ اُس نے خالی بوری اپنی بغل میں چھپائی .....اور شہر کے بڑے چوراہے کو اپنے پیچھے چھوڑ کر چھوٹے چھوٹے قدموں کے ساتھ نکل پڑا۔

کچھ ہی دور جانے کے بعد اچانک اُسے خیال آیا.....

لوگ کہاں گئے ہیں.....شہر کے سارے لوگ عورتیں بچے.....کھو گیا کیا بھیڑ باڑ اُسکے اردگرد ہوتی تھی.....آج وہ اُسے نظر نہیں آ رہی تھی وہ حیران سا رہ گیا۔ مجبور انسان .....کسی کام میں مشغول ہونگے اُسنے خود کو تسلی دی.....لیکن خود کے ایک حصے نے سوال کیا۔ دانشوروں اور سیاست دانوں کی آنکھوں میں کیوں آج پہلی سی اجنبیت جھلکتی ہے.....؟ ماؤں نے کیوں آج اپنے بچوں کو مکانوں کے اندر چھپا دیا ہے.....یہ میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں آج .....اُسکی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا.....اُسکے قدم بھاری سے ہو گئے۔ وہ تھکے تھکے قدموں کے ساتھ چلنے لگا.....اُسے لگا۔ وہ اس شہر میں اکیلا ہے۔ یہاں اُسکی کوئی پہچان نہیں ہے۔

پہلے اسے شک تھا۔ لیکن شہر والوں کی بے حسی اور بے رخی دیکھکر اُسے یقین ہو

گیا۔ کہ ریت ..... ریت ہی ہے!

وہ دور دور تک پھیلے ہوئے مکان ..... سڑکیں۔ کانیں اور لوگوں کو دیکھکر اندر ہی اندر چیخ اُٹھا .....

ریت کا شہر ..... ریت کے مکان ..... ریت کے انسان ..... ریت کا کاروبار ..... چاروں طرف بس ریت ہی ریت!

شہر والوں کی بے رخی نے اُسے ایک گہرا زخم دیا تھا ..... وہ اب جلد سے جلد یہ شہر چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ وہ تیز قدموں سے چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اُسکے قدم ادھر اُدھر لڑکھڑا رہے تھے ..... خشک ہونٹوں پر بار بار تری کرنے سے اُسکی زبان سوکھ گئی تھی ..... اور آنکھوں میں ویران اندھیرے سے چھا گئے تھے۔

بالآخر جب وہ شہر کے آخری موڑ کے نزدیک پہنچا تو دور سے آئی ہوئی ایک آواز اُسکے کانوں سے ٹکرائی .....

"شکر بابا ..... ٹھہر ..... ہمیں مفت شکر دینے والے بابا ٹھہر!"

اُس نے مڑ کے دیکھا ..... بڑے شہر کا ایک چھوٹا سا کوچہ پیار سے آوازیں دے رہا تھا۔ اُسکی جانب بڑھ رہا تھا ..... محض چند لوگ ..... کچھ بچے ..... دو تین عورتیں

وہ اندر ہی اندر شرمسار سا ہو گیا ..... آنکھوں میں آنسوؤں کا ریلا روک کر اپنے اپنے آپ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"سچ اب بھی یہاں موجود ہے۔ یہ نہ ہوتا ..... تو یہ کہتا ..... سفر کی اُسی موڑ پر ٹھہر جاتی جہاں پر کہ اِس نے اپنے قدم سنبھالے ہیں ....."!

..... ☆☆☆ .....

احمد کلیم فیض پوری

پری تم کہاں ہو؟

صبح ہی سے برف باری ہو رہی تھی۔ گھر کی چھت، برآمدہ اور آنگن میں کھڑے درختوں پر برف جمی ہوئی تھی۔ ایک اُداس سناٹا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ لوگ گھروں میں بند تھے۔ دکانوں پر تالے پڑے ہوئے تھے۔ زندگی رُک سی گئی تھی۔

یہ چھوٹا سا گاؤں جس کی آبادی یہی کوئی پچاس ساٹھ گھروں پر مشتمل تھی، پہاڑ کی ترائی میں بسا ہُوا تھا۔ دو، دو چار چار مکانات ایک دوسرے سے مناسب دُوری پر واقع تھے جن کے سامنے مویشیوں کیلئے کشادہ باڑے بنے ہوئے تھے۔ ایک حصّہ پھلواری کیلئے بھی مخصوص تھا۔ قرب و جوار میں اِسی طرح کے کچھ پہاڑی گاؤں اور بھی تھے۔

لوگ عموماً خوش حال تھے۔ مویشی اُن کی دولت اور پتھریلی ڈھلوان زمینوں والے کھیت اُن کا سرمایہ تھے۔ مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے یہ لوگ اپنے علاقہ کی قدیم تہذیب اور روایات سے جُڑے ہوئے تھے۔ پُرانی رسموں کی پاسداری اُن کا مزاج تھا۔ شادی بیاہ اپنے ہی قبیلے میں کرتے، کہیں اور رشتہ جوڑنا سخت ممنوع تھا۔ خلاف ورزی کرنے پر تلواریں نیام سے باہر نکل آیا کرتی تھیں۔

شام ہوتے ہوتے برف گرنا بند ہوگئی تھی، تب لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ دُکانیں کھل گئی تھیں، بازاروں میں رونق لوٹ آئی تھی۔

جوں ہی زندگی متحرک ہوئی پری لحاف سے باہر آئی اور ماں کی گردن میں جھول گئی۔ بَستہ اٹھایا اور ہوم ورک کرنے لگی۔ ہوم ورک مکمل نہ ہوا تھا کہ کتاب ہاتھ میں لی اور ماں کو سبق سنانے لگی۔ ماں بھلا انگریزی کیا جانتی، پھر بھی زور زور سے سُنائے جارہی تھی۔ سبق ختم ہوا تو باری پوئٹری Poetry کی تھی۔ گا گا کر سُنانے لگی۔ یہی poetry وہ ماں کو نہ جانے کتنی بار سُنا چکی تھی۔ ماں اگرچہ بے زار تھی مگر پڑھائی سے اپنی بیٹی کی گہری وابستگی کی بناء پر وہ کچھ نہ کہتی۔ ہاں اگر وہ کسی دن زیادہ ہی اسکول اُوڑھے رہتی تو ماں اس کے گال پر ہلکی سی چپت لگاتی اور صرف اِتنا ہی کہتی کہ..... ''چل ہٹ کیسی دیوانی ہوئی جارہی ہے!'' مگر ماں کا دل پری کی چاہ سے لبریز ہی رہتا۔

کافی دیر سر کھپانے کے بعد پری نے ماں کو دھمکایا..... دیکھ سویٹ مام، کل برف گرنی والی نہیں ہے۔ میں چاہتی ہوں سب سے پہلے اسکول پہنچ جاؤں۔ وہ مُوا لُو لُو بازی مار جاتا ہے۔ صبح جلدی اُٹھا دینا ہاں، اور ماسٹر جی کا ناشتہ ایمیجیٹ immediate تیار کر دیتا..... اوکے؟ کہتے ہوئے دھمادھم سیڑھیاں اُتر کر برآمدے کے جنگلہ سے لگی بَرف ہٹانے میں مشغول ہوگئی۔

ماں سوچتی رہ گئی۔ کیا ہوگیا ہے اِس لڑکی کو بات بات میں انگریزی بولتی ہے۔ میں کہتی ہوں پاگل، میم سے بھی کوئی بیاہ رچائے گا؟ لیکن یہ خیال آتے ہی اُس کا دل بڑا ہونے لگتا کہ کچھ بھی ہو نسلیں گزر گئیں علم کی روشنی تو پہنچی اِس گھر میں پھر وہ من ہی من ماسٹر جی کو دُعائیں دینے لگتی۔

ماسٹر جی نہ جانے کہاں سے اِس بستی میں آوارد ہوئے تھے۔ اُن کا ٹھور ٹھکانہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ کسی کو اُس سے کچھ لینا دینا بھی نہیں تھا۔ گاؤں والوں کیلئے یہی کافی تھا کہ کوئی تو آیا تھا یہاں گیان لے کر، ورنہ اِس علاقہ میں کوئی آنا پسند ہی نہ کرتا تھا۔

ماسٹر جی جوان تھے، خوبرو اور اچھی صحّت کے مالک، سنجیدہ اور خاموش طبیعت، قبیلہ کے سردار سے مدعا بیان کیا۔ اُس نے بخوشی اجازت دے دی تھی اور انہیں ٹوٹی چھت کا ایک بڑا سا کمرہ الاٹ کر دیا تھا جو سردست بچوں کا اسکول اور ماسٹر جی کا مسکن تھا۔

پڑھنے والوں کی تعداد کل مِلا کر بارہ تھی۔ جن میں پانچ لڑکے اور سات لڑکیاں تھیں۔ انہیں میں ایک پری بھی تھی۔ بہت سے لوگ متوجہ نہ ہوئے تھے۔ وہ کہتے ہمارے ڈھور ڈھا کروں کو کون ہنگائے گا۔ وہ یہ بھی سوچتے کہ بچے پڑھ لکھ کر کریں گے کیا؟ کھیتوں اور جنگلوں کا گیان ہی اُن کیلئے کافی ہے۔

گزشتہ پانچ دنوں سے اسکول بند تھا۔ بَرف باری ہوئی تو چھت کے راستے کمرے میں بَرف بھر جاتی۔ مہینہ بھر میں چند روز ہی اسکول لگتا۔ باقی دن چھٹی کے ہوا کرتے تھے۔

شام سے دیر رات گئے تک موسم صاف رہا۔ صبح ہوتے ہی پھر وہی منظر، پری ہڑ بڑا کر اُٹھی۔ گھڑی پر نظر ڈالی۔ دس بج رہے تھے پیر پٹک پٹک کر ماں سے شکایت کرنے لگی۔ اِتنی دیر ہوگئی، جگایا کیوں نہیں۔ چائے کی چسکی لیتے ہوئے ماں نے اِشارہ کیا..... پری نے کھڑکی کھول کر باہر دیکھا تو بسورنے لگی۔ آج پھر اسکول کا ایک دن کم ہو گیا تھا۔

سرنگا کے چھ بیٹیاں تھیں، کوئی بیٹا نہ تھا۔ سب سے چھوٹی پَری تھی۔ اس سے اُوپر کی تمام بیٹیاں بیاہی جا چکی تھیں، بارہ تیرہ سال کی پری بھی بیاہ دی جاتی لیکن ماں کا بے پناہ پیار رُکاوٹ بنا ہوا تھا۔ کئی رشتے آئے مگر وہ ٹالتی رہی۔ دراصل پَری کی جدائی کا خیال ہی ماں کے دل میں کانٹے چبھو دیا کرتا۔ وہ سوچتی یہ بھی چلی گئی تو گھر میں رہ ہی کیا جائیگا۔ جتنے دن بھی نکل جائیں بالآخر بیٹی کو بِدا کرنا ہی ہے، ویسے پری خود بھی ان جھنجھٹوں سے کوسوں دُور تھی۔

پَری سَر سے پاؤں تک پری تھی، ایسی صورت جو پتھّروں کا دل موم کر دے، کئی گبرو جوان اُس کے دیوانے تھے۔ مر مٹنے کو تیار تھے مگر بے نیاز سی پَری اپنے سراپے کی آنچ لئے گھر آنگن سے لگی ہوئی تھی۔ آئینہ دیکھنے کی اُسے کبھی ضرورت پیش نہ آئی تھی۔ جس کا بدن تاج کا حُسن کند کر کے ایک سانچے میں ڈھالا گیا ہو وہ آئینہ کا اعتبار کیوں کرے گی.....؟

اسکول کھل گیا تھا۔

اُدھر کئی دنوں سے پری، ماسٹر جی میں گہری دلچسپی لینے لگی تھی۔ کوئی موقعہ قرب حاصل کرنے کا نہیں چھوڑتی تھی۔ کلاس میں بے تکے سوالات پوچھ کر ماسٹر جی کے آس پاس رہنے کی کوشش کرتی۔ بعض اَوقات چھٹی کے دن بھی کوئی مسئلہ لے کر اُن کے پاس چلی جایا کرتی۔ اُس کی آنکھوں سے پیاس سی جھلکنے لگی تھی۔ جیسے کوئی سوکھی ندی پہلی بارش کے ریلے کی منتظر ہو۔

ماسٹر جی محسوس کرنے لگے تھے۔ وہ جان رہے تھے کہ پَری کا لا اُبالی پن اِس جانب ہے جہاں دوشیزگی کی چاہ چھُپی ہوتی ہے۔ مگر اُنہوں کے کبھی بڑھاوا نہ دیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ قبیلہ در قبیلہ پھیلی اِس بستی میں وہ اَجنبی ہیں، بالکل تنہا۔ ان کا

بے پرواہ ہونا کسی بڑے خطرے کا پیش خیمہ ہوسکتا تھا۔ ایک طرف وہ اِس مقدس رشتہ کا مول بھی جانتے تھے کہ پامال ہوا تو دھرتی پر فرشتے نہیں اُتریں گے۔ اُن سب کے علاوہ ایک بڑی بات یہ تھی کہ پری انار کی کلی کی مانند گداز کیوں نہ ہو اُن کا جی اِس کی طرف تھا ہی نہیں!

ماسٹر جی کے اِس رویہ پر کئی بار پری کی آنکھوں میں مایوسی کے سائے دیکھے گئے تھے مگر نہ جانے کیوں وہ اپنے خوشبوؤں کے سفر کو ناتمام چھوڑ دینے کو تیار نہیں تھی۔

ماگھ کا میلہ آیا تو گاؤں میں ہر طرف چہل پہل تھی۔ لوگوں کے ہجوم سے سڑکیں اُبلی پڑ رہی تھیں۔ قرب و جوار سے آئے آدیباسی اپنے قومی لباس میں چہکتے پھر رہے تھے۔ میلہ میں وہ سب کچھ تھا جس کی کہانیاں بیان کی جاتی ہیں۔

سہ پہر کے وقت پری اپنی سہیلیوں کے ساتھ میلے گئے، جس جگہ نوجوان آدیباسی لڑکے لڑکیاں باہم رقص تھے سہیلیاں وہاں رُک گئیں، پری کا جی نہ لگا۔ وہ انہیں چھوڑ مندر پہنچ گئی۔ اپنی آنکھیں موندے دیوی کے آگے ہاتھ جوڑے ہی تھے کہ نہ معلوم کہاں سے شاکا آدھمکا اور اس کی کلائی پکڑ لی، پری نے فوراً آنکھیں کھول دیں، دیکھا تو شاکا کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ اِس سے پہلے کہ وہ کوئی اور حرکت کرتا، پوری قوت کے ساتھ پری نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ایسی دوڑی کہ گھر جا کر ہی دم لیا۔

فلمی ہیرو سا شاکا پری پر بے حد فریفتہ تھا۔ موقعہ پا کر چھیڑنے کی کوشش کرتا۔ پری کبھی اِس کی طرف ملتفت نہ ہوئی تھی۔ ہمیشہ اُسے حقارت کی نظر سے دیکھا تھا۔ آج وہ حد سے تجاوز کر گیا تھا۔ اِس حرکت پر شاکا کیلئے اس کے دل میں نفرت اور گہری ہوگئی تھی۔ بات آئی گئی ہوگئی۔

میلہ پری کیلئے ایک کسک چھوڑ گیا تھا۔ پتہ نہیں وہ کیا مانگنے دیوی کی چوکھٹ پر گئی تھی۔ اُس نے سُن رکھا تھا کہ انہیں دِنوں دُعائیں مقبول ہُوا کرتی ہیں لیکن شاکا نے سارا معاملہ چوپٹ کر دیا تھا۔ کبھی وہ سوچتی کلائی پکڑنے والا کاش شاکا نہ ہوتا نرلج! پھر دفعتاً ماسٹر جی کا چہرہ ذہن میں گھوم جاتا، تب وہ محسوس کرتی جیسے سُرخ، سفید، نارنجی رنگ اُس کے وجود سے لپٹ گئے ہوں۔

موسم تبدیل ہوا تو روز سکول لگنے لگا۔ بچوں کی تعداد بھی بڑھنے لگی تھی۔ اَب وہ اَپنی ماں سے پڑھائی کا ذکر کم اور ماسٹر جی کا ذکر شدّت سے کرنے لگی تھی۔ اور اِس تذکرے میں بھینی بھینی خوش بُو کی مہک دکھائی دینے لگی تھی۔ ماں نے سنجیدگی سے غور کیا تو اس کا دِل دَہل گیا۔ لگا کئی شبہات نے اُسے گھیر لیا ہے۔ اَپنے گمان کو بدی کی طرف مڑتا دیکھ وہ بے چین ہو اُٹھی تھی۔ سرنگا اَپنی بیٹی سے کہا یہ پوچھتی کہ پری..... ویری سویٹ ڈاٹر! کیا تم اِتنی میچور ہو چکی ہو؟

نصف رات کو ماسٹر جی بلب کی مدھم روشنی میں سَر جُھکائے بیٹھے تھے۔ ایک کُشادہ کمرہ جس کے فرش پر قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ دیواروں پر آویزاں تصویریں اُس گھر کی تاریخ شجاعت بیان کر رہی تھیں۔ چنگھاڑتے ہوئے ہاتھی اور دہاڑتے ہوئے شیروں کی پسپائی کے مناظر پُرکھوں کی بہادری کی داستان سنا رہے تھے۔

سامنے جانور کی کھال والے بڑے سے صوفے میں دُھنسا قبیلہ کا سردار شراب کا آخری گھونٹ لے رہا تھا۔ شیر کی مانند مضبوط گردن، چوڑا چکلا سینہ، لمبی گھنی مونچھیں اُس کی سرخ آنکھوں سے چنگاریاں سی اُبل رہی تھیں۔ دفعتاً ایک گرج دار آواز نے پُرسکون فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا۔

"اِس سے پہلے کہ بے وجہ قتل کر دیئے جاؤ، یہ بستی فوراً چھوڑ دو، ہمیں پری کی

عصمت بہر حال عزیز ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تم بالکل بے قصور ہو، مگر حسد کی آنکھیں نہیں ہُوا کرتیں۔ ہم تمہاری خدمات کیلئے ہمیشہ تمہارے احسان مند رہیں گے۔ لو اِسے رکھ لو....."

ماسٹر جی نگاہ نیچی کئے ہوئے تھے۔ اُپنی جگہ سے اُٹھے اور سَر جُھکائے کمرے سے باہر نکل گئے۔ وہ جانتے تھے کہ سردار کے مُنہ سے نکلا ہوا ہر ایک لفظ حکم کا درجہ رکھتا ہے جس سے سرتابی ممکن نہیں۔ گھر لوٹتے ہوئے ایک لفافہ اُن کے ہاتھ میں تھا۔

بستر پر لیٹے ماسٹر جی اُس چھت کو گھور رہے تھے جو سردار کی بخشی ہوئی تھی۔ اِس ایک برس میں کیسی مہربانیاں تھیں اُن کی، ایک ایک بات یادداشت کے پردے پر منعکس ہوتی جا رہی تھیں اور اَب نوٹوں سے بھرا یہ لفافہ۔ احسان قبیلہ کے سردار ہی کا تھا۔ سوچتے سوچتے انہیں لگا، پہاڑوں پر نِری وحشت ہی نہیں، انسانیت کی خوش بُو بھی پائی جاتی ہے۔ پھر اُنہوں نے سوچا.....

کہاں جاؤں گا؟ کیا واپس اَپنے گاؤں جہاں پُوجا رہتی ہے اور ماسٹر جی کی آنکھوں کی پُتلی کور بھیگ گئی۔ ایک آہ بھرتے ہوئے انہوں نے خود سے کہا..... پوجا' بغاوت نہیں کر پایا میں۔ کیسی شجاعت دَرکار ہوتی ہے۔ سماج سے آنکھیں چار کرنے میں۔ اَپنی محبّت کا گلا گھونٹ کر بھاگ آیا ہوں۔ تم سے بہت دُور۔ اَب لوٹ کر آنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ شاید تم مجھے معاف کر سکو۔

ماسٹر جی نے جیب سے بٹوہ نکالا اور پُوجا کی تصویر میں کھو گئے۔ نہ جانے کب اُن کی آنکھوں میں نیند سما گئی۔ ایک شام ماسٹر جی کی تھرتھراتی آواز فضا میں گونج اٹھی۔

"پری، یہ بستی چھوڑ کے جا رہا ہوں۔ مجھے جانا ہی ہوگا۔ یہ لو کچھ رُوپے اَپنے

پاس رکھ لو اسکول کے کام آئیں گے۔ میرے بعد اِس بستی میں شاید کوئی اور صاحبِ علم آجائے۔ ہاں اپنی پڑھائی جاری رکھنا۔ آج ساری دنیا میں علم کا ہی بول بالا ہے۔

مگر کیوں.....؟ پری روہانسی ہو اُٹھی

'تم نہیں سمجھ پاؤ گی۔ رونا بُزدلوں کیلئے ہُوا کرتا ہے۔ تم ایک جری باپ کی بیٹی ہو۔ جسے حالات کی سنگینی سے کبھی نہ گھبرانا چاہئے اور ہاں زندگی میں ہر وہ کام نہیں کیا جا سکتا جس کے کرنے کو محض اپنا دل کہے'۔

شکست خوردہ سی پری مُڑنے والی تھی کہ ماں درخت کی اوٹ سے نکل کر سرعت کے ساتھ گھر پہنچ گئی۔ سرنگا کو شبہ تھا کہ پری وہیں گئی ہوگی۔ اِسی لئے وہ تعاقب کرتی ہوئی پہنچ گئی تھی۔ اگرچہ وہ اُن کی گفتگو نہیں سُن پائی تھی لیکن شام کے سناٹے میں دونوں کو اِس طرح دیکھ کر ہول گئی تھی۔ وہ سوچے جا رہی تھی کہ یہ لڑکی اپنے گھر کے ساتھ ہی قبیلہ کی رُسوائی کا سبب بنی بنے گی۔ سرنگا کا دل بے تحاشہ دھڑکنے لگا تھا۔

بوجھل قدموں کے ساتھ پری گھر پہنچی۔ دل برداشتہ سی بمشکل ماں سے کہہ سکی۔ ماسٹر جی جا رہے ہیں ہمیشہ کیلئے۔ یہ روپے اُن کی امانت ہیں۔ کہہ رہے تھے اسکول کے کام آئیں گے اور اگلے لمحے وہ بستر پر جا گری۔ روتے ہوئے اُس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔

ماں نے دیکھا پچاس ہزار روپے تھے۔ جن میں سردار کے دیئے ہوئے تیس ہزار شامل تھے۔

زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ بات پکی ہوگئی۔ کل پری کا بیاہ شاکا کے ساتھ ہونے والا تھا۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی جا رہی تھی۔ تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔

اگرچہ آسمان صاف تھا مگر کوئی ستارہ ایسا نہیں چمکا تھا جس کی پری نے جستجو کی تھی۔ شادی کی تمام تر رونقوں کے باوجود ایک عجیب سا خالی پن تھا جو اُس کے وجود کا حصہ بنا ہوا تھا۔

رات کا تیسرا پہر بیتنے کو تھا۔ اُوپر والے کمرے میں تھکی تھکائی سی بہنیں بے خبر سو رہی تھیں۔ پَری اُٹھی اور قدِ آدم آئینہ سے جا لگی اُس نے حیرت سے اپنی مانگ دیکھی۔ افشاں سے بھری مانگ اَنگارے اُگل رہی تھی۔ گلے میں سونے کا بڑا سا ہار اور کانوں میں سنہرے بُندے۔ اُس نے غور سے دیکھا سُرخ آنچل پر ستارے جھلملا رہے تھے۔ وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ نہیں نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ اُس نے خود سے کہا۔ آئینہ کی طرف پیٹھ کر کرے اُس نے اپنے سراپے کا جائزہ لیا۔ کوئی سولہ سنگار نہ تھا۔ بڑی جز بز ہوئی۔ دوبارہ آئینہ کے سامنے گئی۔ کم بخت اس بار بھی جھوٹ بول رہا تھا۔ اُس کا جی چاہا، آئینہ توڑ دے، مگر وہ ایسا نہیں کر سکی۔ چھنا کے آواز اس کے منصوبے پر پانی پھیر دیتی۔ اُس نے حقارت سے آئینہ پر تھوک دیا، جو اَب بھی اُسے دلہن کے رُوپ میں پیش کر رہا تھا۔

دفعتاً ماسٹر جی کی بات اُسے یاد آ گئی۔ انہوں نے کہا تھا۔ زندگی میں ہر وہ کام نہیں کیا جا سکتا جس کے کرنے کو محض اپنا دل کہے۔ وہ مُسکرا دی۔ دل میں کہا..... مگر وہ کام ضرور کرنا چاہئے جس سے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہو!

پری آہستگی کے ساتھ عقبی دروازے سے نیچے اُتری، چوروں کی طرح اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں، کوئی نہ تھا۔ پھر چند منٹوں بعد ہی لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی اُس پل پر جا پہنچی جس کے نیچے تیز پہاڑی نالہ بہہ رہا تھا۔ اس نے گہرے پانی میں چھلانگ لگا دی!

سارا گاؤں ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ سہیلیوں کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں، نوجوانوں پر سکتہ طاری تھا۔ بڑے بوڑھوں کی سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ کہہ رہے تھے، یہ روشنی کی موت ہے۔ اَب نہ جانے کب اس بستی کے افق پر سورج اُگے۔ علم کا سورج، ان کی کبھی نہ بھیگنے والی داڑھیاں، آنسوؤں سے تر تھیں، سوگواروں کے اَتھاہ جنگل میں سرنگا کہیں نہیں تھی، اُس پر دَورے سے پڑ رہے تھے۔

وقت تھما، لیکن سرنگا اَپنے ہوش وحواس گنوا چکی تھی۔ اَپنے آپے میں نہیں تھی۔ اکثر راتوں کو اُٹھ کر پُل پر نِکل جایا کرتی۔ کچھ ڈھونڈنے کی دیوانہ وار کوشش کرتی اور چیخ چیخ کر پُکارتی۔ پَری..... تم کہاں ہو؟

☆☆☆

مصنف : نورشاہ

تبصرہ نگار : عُمر مجید

بند کمرے کی کھڑکی

کشمیری مورّخ پنڈت کلہن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے نئے کشمیر کو پُرانے کشمیر کے ساتھ جوڑ دیا۔ کلہن نے پُرانے کشمیر کی تاریخ اتنے دلچسپ انداز میں لکھی ہے کہ پڑھنے والے کو مزیدار ناول کا لُطف آجاتا ہے۔

نورشاہ کی ڈائری کے اَوراق پڑھتے پڑھتے انسان پر اِسی نوعیت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ کلہن نے کشمیر کی تاریخ بارہویں صدی عیسوی میں لکھی۔ نورشاہ نے ۳ر مارچ ۱۹۷۲ء کو اپنی ڈائری لکھنا شروع کی۔ نورشاہ بنیادی طور ایک افسانہ نگار ہیں۔ اُن کی کہانیاں دراصل ایک تخلیقی ساحر کا ''سحر صد رنگ'' ہیں اور یہی ادبی جادو اُن کی ڈائری کے اوراق میں بھی ملتا ہے جو قاری کو مکمل طور اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

اختصار، بذلہ سنجی WIT کا حُسن ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈائری لکھنے کیلئے بھی ''ڈائری نِگار'' کا بذلہ سنج ہونا لازمی ہے۔ اگر وہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کے فن سے واقف ہے تو اُس کا لکھا ہوا ایک ایک لفظ ''ہزار داستان'' بیان کرتا ہے اور یہی ایک ''ڈائری نگار'' کے فن کی کسوٹی بنتا ہے۔

اپنی اِس تازہ تخلیق ''بند کمرے کی کھڑکی'' کے پیشِ لفظ میں نورشاہ لکھتے

ہیں۔ ''ڈائری لکھنا ایک عادت ہے یا ضرورت، ایک مشغلہ ہے یا مجبوری۔ میں نے اِس بارے میں سنجیدگی سے کبھی نہیں سوچا ہے لیکن آج مجھے کہنے دیجئے کہ یہ کام ہے بہت سنجیدہ۔ ڈائری لکھنا گویا کسی منظر کو کیمرے میں اُتارنے کے مترادف ہے۔ کسی ایک لمحے کو نوکِ قلم کے سُپرد کرنا ہے گذرے کل کو لاشعور کے کمرے میں بند کرنا۔ یادوں اور مشاہدوں کو اُپنے من پسند فریم میں سجانا (چھپانا) ہے۔''

آپ کو مصنف کے ان خیالات سے اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن میں اتفاق نہیں کرتا۔ کیونکہ ایک فوٹو گرافر کسی منظر، خیال، حادثہ، واقعہ، خبر، شخص کی انتہائی خوبصورت منظر کشی تو کر سکتا ہے لیکن احساسات اور جذبات کو اُجاگر کرنا ناممکن ہے۔ مونالزا جیسا مصوری کا شاہکار بار بار بن نہیں سکا ہے۔ اپنی ڈائری کے اَوراق میں نور شاہ نے شعوری یا غیر شعوری طور پر احساسات و جذبات کو بھی الفاظ کا خوب صورت لباس پہنایا ہے۔

ڈائری لکھنا ایک فن ہے اور ادبِ عالیہ کی عمدہ مثال۔ روز نامچہ ہو یا تذکرہ، تاریخ کے اہم مواخذ بنتے ہیں۔ ہیون سانگ، مارکو پولو، البیرونی، جہانگیر، برنیر، ابن بطوطہ اور جانے کتنے مسافر ہوئے ہیں۔ ریگزاروں، کوہساروں، بیابانوں سنگلاخ چٹانوں سے گذرے اور نوکِ قلم سے تاریخ میں نئے ابواب رقم کئے۔

نور شاہ موجودہ زمانے کے ممتاز اور معتبر افسانہ نگار ہیں جو پچھلی پانچ دہائیوں سے مسلسل لکھتے جا رہے ہیں۔ یہ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ انہوں نے اردو اَدب کو بہترین افسانے اور ناول دیئے ہیں۔ اخبار ''کشمیر عُظمیٰ'' کا اجرا نہ صرف ریاست جموں و کشمیر کی صحافتی دنیا میں ایک مبارک واقعہ تھا بلکہ ریاست کی ادبی دنیا کیلئے نیک فال ثابت ہوا ہفت روز کشمیر عظمیٰ اور پھر روز نامہ کشمیر عظمیٰ نے ادبیات کی طرف خصوصی توجہ دی۔ نور شاہ ہفت روزہ کشمیر عظمیٰ میں ایک ادبی ڈائری لکھنے کا فریضہ اپنے

کاندھوں پر لیا اور ادبی شخصیات اور عصرِ حاضر کے ادبی حالات واقعات کو اپنے منفرد اور مخصوص رومانوی انداز میں پیش کرنے لگے۔ لفظ ''رومان' اپنے اندر وسیع معنی رکھتا ہے۔ جس طرح غزل زندگی کی تمام تلخ حقیقتوں اور دلنشین خوابوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اُسی طرح رومان بذات خود زندگی ہے۔ کوہ پیماں ہو یا کرکٹ کا کھیل، افسانہ ہو، ناول، خط ہو یا ڈائری کا ورق، وصلِ محبوب ہو یا غمِ روزگار۔ اگر رومان سے خالی ہو تو بے رنگ و بو ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جس طرح بچپن بذاتِ خود معصومیت ہے جوانی بذاتِ خود حُسن ہے اور بڑھاپا بذات خود ایک بیماری۔ اسی طرح انسان اپنی پہلی کربناک چیخ سے اپنی آخری آنسوناک سانس تک رومان زدہ ہوتا ہے۔ زندگی کے تمام دھارے ''رومان' کے چشموں سے پھوٹتے ہیں۔ زندگی رومان سے عبارت ہے اور نسلِ آدم کی بقا اسی سے قائم و دائم ہے۔ لیکن رومان بھی خوب صورت شائستگی کا خواہاں ہے!! شائستگی پاکیزہ نہ ہو تو رومان، رومان نہیں رہتا۔ حیوانیت بن جاتا ہے!!

نور شاہ کی ڈائری کے بعض اوراق کے اقتباسات: ۱۸،۲،۲۰۰۶

''میں آج وریندر پٹواری سے ملنے اُن کے گھر گیا۔ وہ اب کئی برسوں سے غالبؔ کی دِلی میں رہتے ہیں۔ کشمیر کے جواں سال کہانی کار اور شاعر زاہد مختار بھی اُن کے ہاں قیام پذیر تھے۔ یہاں میں نے اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا کرشمہ دیکھا۔ وریندر پٹواری ایک حادثے کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہو چکے ہیں، وہ کُھل کر بول بھی نہیں بول سکتے۔ البتہ اُن کی دونوں آنکھیں سلامت ہیں جن سے وہ دیکھ سکتے ہیں پہچان سکتے ہیں اور پڑھ سکتے ہیں۔''

غور کیجئے۔ آنکھیں سلامت ہیں۔ جن سے وہ دیکھ سکتے ہیں۔ پہچان سکتے ہیں اور پڑھ سکتے ہیں۔ اب اس سے بڑا زندگی کا رومان اور کیا ہو سکتا ہے۔

نظر.....صاحبِ نظر.....پہچان ہے۔صاحبِ نظر ہونا بہت بڑی بات ہے: نور شاہ نے کوزے کو دریا میں بند کر دیا ہے۔ وریندر پٹواری کے فن پر اس بہتر تبصرہ کیا ہو سکتا ہے۔ ''تحفۂ درویش'' ۲۱،۱۲،۱۹۸۷

آج کشمیر کے معروف و مشہور ڈرامہ نِگار علی محمد لونؔ ایک حادثہ میں جان بحق ہو گئے۔ وہ شام کے وقت اپنے گھر اِندرانگر کی جانب ایک تھر ویلر سے جا رہے تھے کہ تھری ویلر اندرانگر میں ہی بجلی کے ایک کھمبے سے ٹکرا گیا اور وہ شدید زخمی ہو گئے۔ اُنھیں ہاسپٹل لے جایا گیا لیکن خون بہہ جانے کی وجہ سے ڈاکٹر ان کی جان بچانے کی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ خبر سب سے پہلے مجھے میرے گھر آ کر رشید نیوز ایجنسی کے مالک عبدالرشید بٹ نے سنائی۔ فوری طور گھر سے نکلا۔ باہر ڈاکٹر نصیر احمد شاہ صاحب ملے۔ وہ بھی یہ خبر سُن چکے تھے۔ ہم دونوں نے اندرانگر کا رُخ کیا۔ وہاں ایک کہرام مچا ہوا تھا۔''

اردو کشمیری کا ایک اعلیٰ پائے کا ادیب، ایک ہمدرد انسان، ایک مخلص دوست.....ڈائری کے اس ورق میں ایک پورے یُگ کا حال درج ہے۔

وہ زندہ ہیں اہلِ دل کے سینوں میں ۵،۱۵،۲۰۰۴

یہاں وہ نہیں ہے

اُسے گھر سے نکلے مدت ہوئی

ہم کو وہ چھوڑ چکا ہے شاید

جی ہاں سوم ناتھ سادھو کو گھر سے نکلے ۲۲ سال ہو چکے ہیں آج ہی روز ۱۹۸۲ء میں آل انڈیا انسٹی چیوٹ آف میڈیکل سائنسز دہلی میں اُن کا دیہانت ہو گیا۔ اتنی مدت گزرنے کے باوجود لگتا ہے کہ جیسے یہ کل کی ہی بات ہو جیسے کل تک سادھو ہمارے ساتھ

تھے اور آج .....!"

یادیں ..... جو دِن میں پکھیرو ہوتے تو میں اُنھیں پنجرے میں پالتا۔ جتن سے پالتا۔ موتی کے دانے کھلاتا۔ ڈائری کا یہ ورق دوست کی ضمانت، اور اُس رفاقت کے نہ رہنے پر خون کے آنسو روتا ہے لیکن سوم ناتھ سادھو جیسے منفرد اور ممتاز ریڈیو آرٹسٹ اور نثر نِگار کے ساتھ ساتھ اُن کے والد پریم ناتھ پردیسی کی تاریخ بھی بیان کرتا ہے اور خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔ "وہ گزرا کل"

مطالعہ ایک طالب علم کے لئے کِسقدر ضروری ہے ایک محنتی اور فرض شناس اُستاد "معلم" ہی بتا سکتا ہے اور انسان کو اُپنے آپ کو مہد سے لحد تک طالب علم ہی سمجھنا چاہیے۔ لیکن ہمارے ادیب اور شاعر کسقدر بے علم اور علم سے دور ہوتے ہیں اس کا افسوس بھی نور شاہ نے اپنی ڈائری کے اس ورق میں کیا ہے۔ ۱،۲،۲۰۰۵

ایک سال قبل مجھے ایک ناول "میری روٹی کہاں ہے" پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ ناول "اشوک کول" نے تحریر کیا ہے۔ وہ سویہ بگ بڈگام کے رہنے والے ہیں لیکن اَب وہ دُرگا نگر جموں میں رہتے ہیں۔ اس ناول کا پیشِ لفظ حیات احمد حیات صاحب صدر و گدی نشیں علم و ادب ٹرسٹ بڈگام نے تحریر کیا ہے۔ اُنہوں نے اشوک کول کی ادبی ریاضت اور محنت کی تعریف کی ہے۔ ناول پڑھنے کے بعد جب کول صاحب سے فون پر میری بات ہوئی تو وہ کہنے لگے کہ اُنہوں نے بیس ناول لکھے ہیں لیکن مالی دشواریوں کی وجہ سے صرف ایک ہی ناول شائع کر سکے ہیں۔ وہ کسی ناشر کی تلاش میں ہیں۔ میں نے اُنھیں مشورہ دیا کہ جموں میں بہت سے لکھنے والے ہیں جو کشمیر کے فرزند ہیں وہ اس سلسلہ میں بہتر رہنمائی کر سکتے ہیں اور مدد بھی کر سکتے ہیں۔ انہوں نے کچھ نام لینے پر اصرار کیا۔ تو میرے منھ سے جو پہلا نام نکلا وہ پُشکر ناتھ کا تھا۔ وہ کہنے لگے یہ پشکر ناتھ

کون ہیں اور کیا کام کرتے ہیں۔ میں تو اُن کا نام پہلی بار سُن رہا ہوں۔ پھر میں نے پروفیسر رتن لال شانت کا نام لیا۔ یہ نام بھی اُن کے لئے نیا تھا۔ پھر میں نے سوچا شاید پیارے ہتاش کو جانتے ہوں گے۔ میں ہتاش کو ایک چلتی پھرتی ڈکشنری سمجھتا ہوں۔ جب اُنہوں نے یہ نام سُنکر خاموشی اختیار کی تو اس قدر "ویل انفارم" ہونے پر میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھتا۔ "ہم ہیں اور گردشِ زمانہ"

طوالت کے ڈر سے میں صرف ان پانچ اقتباسات کو ہی پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ وگرنہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس ڈائری کا ہر ورق مقصدیت کا نقیب ہے۔

.....☆☆☆.....

ملک کے

نامور علمی اور ادبی اداروں کی کتابوں کے

ساتھ ساتھ کلچرل اکیڈیمی کی مطبوعات خریدنے

کے لئے تشریف لائیں

کتاب گھر

مولانا آزاد روڈ سری نگر / کنال روڈ جموں / فورٹ روڈ لیہہ لداخ

☆☆

زاہد مختار

ایک تاثر

نُور شاہ کا اَفسانوی مجموعہ ''بے ثمر سچ''

مجھے نور شاہ کی بہت ساری تخلیقات ایک ساتھ پڑھ تھا اور یوں ''بے ثمر سچ'' کو میں نے مصنف کی ترتیب کے اور اُس میں شایع مختلف اہل قلم کی آرا کے بغیر پڑھا۔ پہلے افسانے کو شاید پانچوں نمبر پہ اور آخری افسانے کو شاید گیارہویں نمبر۔ میری یہ بے ترتیبی قلم کار اور قاری کے درمیان ترسیل کی ناکامی کا سبب نہیں بنی۔ میں نے نور شاہ کے ''سچ'' کو حرف حرف پڑھنے کے بعد اُسکے ''ثمر'' کو پانے میں شاید کامیابی حاصل نہ کی ہو لیکن میرا مطالعہ ''بے ثمر'' بھی نہ رہا۔

''سچ'' کے قرطاس پہ عورت سوار ہے اور عورت کے اعصاب پر ''کتے'' کی طرح جنس..... یا پھر ایک ہی موضوع کے مختلف رنگ کتے اور انسان کو ہم رنگ بنا چکے ہیں۔ ہر چیز میں کیا صرف سیکس ہے۔ فرائڈ کی ''سچائی'' سے لیکر نور شاہ کے ''بے ثمر سچ'' تک ایک سلسلہ ہے۔ تجرباتی جنس کا، ہم جنس پرستی کا، اور جنسیات کے اُن لمحوں کا جنہیں ایک عمر رسیدہ شخص بھی اپنی آنکھوں میں جذب کرتا ہے۔ ''زمان و مکان'' اور زبان و بیان کے تناظر میں مجھے کسی کفر سے ہمکنار نہیں ہونا ہے کیونکہ وہ کافر ہی ہوگا جو قلم کار کی زبان پہ دسترس سے انکار کرے۔ لیکن قلم

کار کو جہاں اس سیکس سے باہر بھی کچھ موضوعات ملے ہیں اُن پر بھی بڑے باریک پردے پڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ''آپ آپ''..... ''لکیریں''..... بس ایک فلسفہ''..... مُشتے نمونے از خروارے

''گھوڑی سے لیکر کتیا تک..... ہیڈ ماسٹر سے لیکر گھوڑے بان تک اور حد یہ کہ باتھ روم سے لیکر بیڈ روم تک بس اُنہی تین حروف (SEX) کا حصار،۔ قاری کے ذہن کو تمام غم و آلایشوں کی دنیا سے دور لے جا کر ایک سجے سجائے تصوراتی عالم میں مقید کرنے کا جتن۔

میں عصمت، فرائڈ اور منٹو کی کتابوں کے شلف میں نور شاہ ''سچ'' بھی سجا کے رکھ دوں گا لیکن سب کی نظروں سے چھپا کے۔ وہ حصہ میری لائبریری کا ''گوشہ ممنوعہ'' کہلاتا ہے۔ کتاب تالہ بند حصے میں قید ہو جائے گی۔ معاملہ تواریخ کا ایک حصہ بن جائے گا اور تاثر بس اتنا کہ.....

''انسان شاید خود ''اُس کیچڑ'' کا حصہ ہونے کے باوجود جوتے صاف کر کے ہی اپنے گھر کی دہلیز کو پار کرتا ہے۔''

میں ایسے افسانوں کی فنی خوبصورتی پر ایک قصیدہ بھی لکھ سکتا ہوں لیکن میں ان موضوعات کی تشہیر کو بھی ''گناہ'' سمجھتا ہوں۔ میں مجموعے میں شامل ''رات کا سورج'' اپنے گھر کے ہر گوشے میں تاباں دیکھنا پسند کرو رنگا لیکن میں ''خوشبو کا سفر'' پڑھ کے بھول جانا چاہتا ہوں۔ یہ ایک قاری کی پسند ہے اور یہ بھی ایک سچ ہے کہ قاری کی پسند کا اثر قلمکار کے ارادوں کو متزلزل نہیں کرتا۔ کوئی بدن کے طاق پہ لطافت اور لذت کا ایک گلدان سجانا چاہتا ہے اور کوئی انہیں لذتوں اور لطافتوں میں ایک ان دیکھی تڑپ کو محسوس کرتا ہے اور بقول بشیر شاہ..... نور شاہ

منٹو نہیں ہو سکتا۔ ''نور شاہ کی سانس سانس کہانی ہے''۔ مجھے بشیر شاہ کی اس بات سے اتفاق ہے (کتاب کا یہ حصہ میں نے آخر میں پڑھا ہے) لیکن کیا ایک حساس انسان کی ہر سانس، ہر لمحہ، ہر پل، ہر حال میں بس ایک ہی راگ الاپتی ہے۔ مدت سے کسی پیاسے کے لئے ایک خوبصورت عورت کے جسم سے زیادہ دو بوند پانی کی اہمیت بھی ہوتی ہے۔

انسانی ارتقا میں ''ایک لمحے کی جنت'' بھی ہے لیکن یہی لمحہ پوری زندگی نہیں۔!

نور شاہ بسیار بھی لکھتے ہیں اور خوب بھی لیکن خوبیوں کے ساتھ مجھے ایک ساتھ اتنے افسانے پڑھنے کے باوجود بھی نہ جانے کیوں ''یک رنگی مناظر'' نگاہوں کے سامنے رقص کرتے ہوئے دکھائی دیئے۔ مجموعہ ''بے ثمر'' نہیں ہے کیونکہ اس پر بہت کچھ لکھا جائے گا اور اس پر بہت کچھ لکھنے کی بھی گنجائش ہے۔ میں صرف ایک تاثر کو الفاظ دینے کی جرأت کر رہا ہوں۔ میں مجموعے کی قیمت، کمپوزنگ، جلد سازی یا خوبصورتی سے الگ اس میں شامل کہانیوں کی روح میں اُترنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ہر روح..... جیسے جسم کے چھیتڑوں میں چھپی ہوئی۔ ہر ذی روح جیسے ایک کتے یا کتیا کی طرح زبان باہر نکالے ہوئے رال ٹپکاتا ہوا۔ حیوانیت اور انسانیت کی تمام حدیں مسدود۔ اور قاری بھی شاید اس بات کا اعتراف کرتا ہوا کہ یہ سب ''سچ'' ہے لیکن..... اس ''سچ کی صلیب'' پر کس کو لٹکایا جائے۔ ایسے افسانوں کو چٹخارے لے کر پڑھنے والے کو یا ایسے افسانے کی تخلیق کو علم کی کوکھ میں پالنے والے کو۔ مرض کی نشاندہی مرض کی دوا نہیں۔ تشخیص کا اصلی مرحلہ تب آتا ہے جب قلم کار محرر کے بجائے معالج بنتا ہے۔ یہاں نور شاہ نے

"تشخیص" کو "عریاں" کر کے تو رکھ دیا ہے لیکن وہ اپنے قلم کو نشتر بنانے میں کامیاب ہوتے ہوئے (کم از کم مجھے) دکھائی نہ دئے۔

ہر نیا فن پارہ، لباب لب بھرے ہوئے دودھ کے پیالے میں خوشبو بن کے سمائے تو اسے فنکار کا معراج کہا جا سکتا ہے۔ اضافت رسمی ہو یا روایتی۔ شعوری ہو یا غیر شعوری۔ ہر زائد قطرہ جام سے باہر چھلک پڑتا ہے اور چھلکتے ہوئے قطرے خود بھی پیاسے رہ جاتے ہیں اور پیاسوں کی بھی پیاس نہیں بجھاتے۔ اپنے آپ کو یا گھسے پٹے موضوعات کو دہرانے کا عمل ری مکس کا رواج سہی لیکن اسکا اثر زیادہ دیر تک ادب کے ایوان میں نہیں رہتا۔..... (اختلاف کرنے کی گنجائش ہر حال میں موجود ہے)

اللہ کرے نور شاہ کا قلم قاری کی لذتوں کو نہیں بلکہ اُن کی روحوں کو سیراب کرے کیونکہ نور شاہ کے قلم میں دم ہے۔ نور شاہ افسانے کے فن سے آشنا ہے۔ نور شاہ زبان و ادب کا پاسباں ہے۔ وہ موضوعات کی زرخیزی سے کئی چنار اُگا سکتا ہے اور اپنے فن کے آسمان پہ کئی سورج روشن کر سکتا ہے۔ میری دعا ہے کہ "سچائیوں" کے چہروں سے اُس کے قلم کی نوک پردہ اُٹھاتی رہے۔ کیونکہ اُردو ادب میں نور صاحب جیسی قد آور شخصیت سے ابھی ہم جیسے طفل مکتب بہت کچھ سیکھنا چاہتے ہیں۔

///☆☆☆☆☆☆///

SHEERAZA (URDU)

Volume:46 No.2

Editor:
M.Ashraf Tak

Published by
J&K ACADEMY OF ART, CULTURE & LANGUAGES
Srinagar/Jammu

Printed at Jk Offset Printers, 315 Jama Masjid Delhi 110006